نگار

قیمت ۸ر

اصحاب کہف

(ڈراما)

اڈیٹر نگار کے قلم سے

تمام وہ حضرات جن کا نام ۳۱ جنوری ۳۶ء کو رجسٹر خریداران میں مندرج پایا جائیگا

صرف بارہ آنے کے ٹکٹ موصول ہونے پر حاصل کر سکتے ہیں۔

مینجر

نگار

جلد ۲۸	فہرست مضامین اکتوبر ۳۵ء	شمارہ ۴

ملاحظات		۲
نجوم کے بعض تاریخی وعلمی مباحث	عبدالمالک آروی	۹
جھانسی کی رانی		۲۵
روحانئین مغرب کی شعبدہ کاریاں		۴۱
دُم دار ستارہ	تحسین الدین علوی۔ بی۔ اے	۴۸
معجزہ وخوارق عادات کی حقیقت	عبیداللہ قدسی	۵۱
انتخاب	سروپ رانی نگار	۵۶
باب الاستفسار		۵۹
کارامروز نمبر کے تنقیدی حصہ پر ایک غیر جانبدارانہ تبصرہ	ریاضت انصاری	۶۴
باب المراسلۃ والمناظرہ		۷۳
بقیہ ملاحظات		۷۶

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۸	اکتوبر ۱۹۳۵ء	شمارہ ۴

ملاحظات

دار العلوم دیوبند کے رسالۂ قاسم العلوم کی جاہلانہ ذہنیت

ذات نبوی کی ناقابل برداشت توہین

اور

احادیث پر ایمان رکھنے والوں کا مضحکہ خیز اسلام

آج اگر آپ کسی مسلمان کے سامنے دار العلوم دیوبند کا نام لے دیجئے تو وہ تقریباً اسی جذبۂ تقدس و احترام کو محسوس کرنے پر مجبور ہوگا جو "حرمین" کا نام سنکر اس کے اندر پیدا ہوتا ہے، اگر کسی سے یہ کہدیجئے کہ فلاں مسئلہ میں علماء دیوبند نے یہ رائے ظاہر کی ہے تو وہ اس کی صداقت پر اس طرح ایمان لائے گا گویا کہ خود روح القدس نے براہ راست اس سے گفتگو کی ہے اور اگر کسی فتوے پر وہاں کے واقفان شریعت نے مُہر ثبت کر دی ہے تو اسکے معنے یہ ہوتے ہیں کہ آفتاب کے طلوع و غروب سے انکار ممکن ہے لیکن اس سے انحراف کسی طرح ممکن نہیں کیوں ؟- اس لئے کہ دیوبند علم الحدیث کا گہوارہ، اقوال رسول کے ضبط و حفظ کا زبردست ادارہ اور خصائص نبوت

کی تعیین کا نہایت معتمد علیہ دائرۃ المعارف ہے۔

یہ ہے وہ رسوخ اعتقاد دار العلوم دیوبند اور وہاں کے علماء کرام کے متعلق جس میں نہ صرف عوام بلکہ ہمارے خواص بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن آئیے آج کی صحبت میں ہم آپ کو بتائیں کہ یہاں کے محدثین عظام خصائص نبوی کا کتنا گہرا علم رکھتے ہیں اور مذہب اسلام کے ساتھ اُن کا کیا سلوک ہے۔

وہ حضرات جو دار العلوم دیوبند کے نام سے آگاہ ہیں وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہوں گے کہ اس ادارہ کی طرف سے ایک رسالہ بھی شائع ہوتا ہے جو اپنی مذہبی تحقیق اور دینی خدمت کے لحاظ سے پرستاران دیوبند کے نزدیک صحیفۂ مقدس کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا نام "قاسم العلوم" ہے۔

افسوس ہے کہ یہ رسالہ میرے پاس نہیں آتا اور اس لئے مجھے نہیں معلوم کہ اسوقت تک وہ تحقیق علمی کے کتنے دریا بہا چکا ہے۔ مجھے اس جریدہ کے وجود کا علم رسالہ بلاغ امرتسر کے ذریعہ سے ہوا جس نے اپنی ماہ ستمبر کی اشاعت میں اس کی ایک عبارت نقل کرکے بے اختیارانہ مجھے ان سطور کے لکھنے پر مجبور کردیا۔

قاسم العلوم کے جس پرچہ سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے وہ جمادی الاولی ۱۳۵۴ھ کا پرچہ ہے جس میں رسول اللہ کی تعدد ازدواج پر بحث کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ:-

"ہم ناظرین کو پھر ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ صحیح حدیث میں موجود ہے کہ حضرت انس نے جب یہ بیان کیا کہ ایک شب میں آپ نے تمام موجودہ ازواج کے ساتھ ہمبستری فرمائی تو لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ اتنی طاقت جناب رسول میں موجود تھی۔ اس پر حضرت انس نے فرمایا کہ ہم لوگ آپس میں اُس زمانہ میں گفتگو کیا کرتے تھے کہ آنحضرت کو چالیس مردوں کی قوت باہ عطا کی گئی ہے۔ یہ قول حضرت انس کا نہایت صحیح اور قوی معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس آخری عمر میں اس قدر موانع کے موجود ہوتے ہوئے آپ کو روزانہ ایک زوجہ سے ہمبستری کی طاقت نہیں ہوسکتی تھی چہ جائیکہ نو عورتوں سے ایک شب میں ہمبستر ہوں۔ اب اس سے اندازہ کرنا چاہئے کہ جبکہ امت کے ہر ایک مرد کو چار عورتوں نکاح کرنا جائز ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سو ساٹھ عورتوں کے سنبھالنے کی قوت ہونی چاہئے۔

ہم ناظرین کو اس کے بعد ایک اور ضروری بات یاد دلانا چاہتے ہیں۔ علامہ سیوطی خصائص کبریٰ میں حضرت انس کا منقولہ مذکورہ بصدر نقل فرماتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن چالیس مردوں کی قوت باہ آپ کو دی گئی تھی وہ اس دنیا کے مرد نہیں بلکہ جنت کے چالیس مردوں کی قوت آپ کو دی گئی تھی اور چونکہ احادیث صحیحین سے یہ بات دکھائی گئی ہے کہ جنت میں ہر مرد کو دنیا کے سو مردوں کی قوت

دی جائے گی اس لئے آنحضرت علیہ السلام میں دنیا کے چار ہزار مردوں کی قوت ہونی چاہئے۔ اس لحاظ سے بقاعدہ چار ازواج چاہئے کہ آپ کو ۱۶ ہزار ازواج کی اجازت دیجائے اور آپ میں اتنی ہی ازواج کی قوت موجود ہونی چاہئے۔ (قاسم العلوم جمادی الاول ۱۳۵۴ھ)

رسول اللہ کی کثرت ازواج کا مسئلہ ہمیشہ غیر مسلموں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور انھوں نے ذات نبوی پر ہمیشہ شہوت پرستی کا الزام قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا جواب اہل علم کی طرف سے ہمیشہ یہی دیا گیا کہ رسول اللہ کا متعدد شادیاں کرنا کسی جذبۂ شہوانی کی بنا پر نہ تھا بلکہ صرف اُسوقت کے سیاسی و معاشری حالات کے اقتضاء سے تھا۔ لیکن علوم اسلامی کے مرکز، دارالعلوم دیوبند کے صحیفہ "قاسم العلوم" کے ذریعہ سے یہ حقیقت آج بالکل پہلی مرتبہ واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ کا گنتی کی چند شادیاں کرنا، حقیقتاً آپ کا انتہائی ضبطِ نفس تھا، ورنہ آپ کے جذبۂ شہوانی کا اقتضاء تو یہ تھا کہ آپ سولہ ہزار عورتوں سے بھی شادی کرتے تو کم تھا —— خوشا رعایت ذوق!

اس مسئلہ پر اسوقت تک جو کچھ لکھا گیا وہ اُس عہد کی معاشرت و سیاسیات کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا رسول اللہ کے غیر معمولی بلند اخلاق کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا، لیکن چونکہ دیوبند کو تمام علوم کے مرکز ہونے کا فخر حاصل ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ عہد حاضر کے تازہ ترین علم "شہوانیات" (Sexology) کو نظر انداز کر جاتا اور اس کے اُصول کو سامنے رکھ کر رسول اللہ کے تعدد ازدواج کا استحسان ایک نہایت معتبر حدیث کے ذریعہ سے ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتا۔

ایک بار پھر قاسم العلوم کی عبارت کو پڑھئے اور درود بھیجئے اُن علماء کرام پر جن کی وساطت سے سالہا سال کی پڑی ہوئی گتھی اس طرح آسانی سے سلجھ گئی —— اس سے قبل تو غیر مسلم کہہ سکتے تھے کہ رسول اللہ کی کثرت ازدواج کو جائز ثابت کرنے کے لئے معاشرت و سیاست کی بحثیں چھیڑنا صرف بہانہ ہے، محض تاویل ہے۔ لیکن اب تو انکو سوائے دم بخود رہجانے کے کچھ چارہ ہی نہیں کیونکہ اتنی غیر معمولی قوت رکھنے کے بعد ان کا متعدد شادیوں پر مجبور ہو جانا بالکل فطری مجبوری تھی اور اس پر معترض ہونا گویا فطرت پر اعتراض کرنا ہے۔ یہ ہے وہ کھلا ہوا نتیجہ جو قاسم العلوم کی پیش کردہ حدیث سے نکلتا ہے —— واشہد باللہ انی بریٔ مما تشرکون ——

آج بھی مسلمانوں کے مذہبی جوش کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کے اکابر کا ذکر نامناسب الفاظ میں کیا جاتا ہے تو وہ جان لینے اور جان دینے کی پرواہ بھی نہیں کرتے، چنانچہ گزشتہ چند سال کے اندر اس قسم کے متعدد واقعات پیش آ چکے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کی نگاہیں اس باب میں لیکھ رام اور راجپال ہی کی طرف پڑتی ہیں اور وہ خود اپنی جماعت کے اُن افراد کو نظر انداز کر جاتے ہیں جو حقیقتاً بانی ہیں رسول اللہ کی توہین کے۔

یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہنا چاہئے کہ آریہ اور عیسائی جماعت کے اعتراضات اسلام و بانی اسلام پر وہی ہیں جو

خود مسلمانوں کی روایات مذہبی اور کتب احادیث سے مستنبط ہوتے ہیں اور اگر کوئی فرق ہوتا ہے تو صرف الفاظ و انداز تحریر کا۔ مثلاً آپ اسی حدیث کو لیجئے کہ اگر کوئی آریہ حضرت انسؓ اور علامہ سیوطی کا حوالہ دئے بغیر یہ لکھدے کہ "مسلمانوں کے رسول اسقدر پُرشہوت تھے کہ جب تک وہ ہر رات نو عورتوں سے ہمبستر نہ ہو لیتے اُن کی تسکین نہ ہوتی" تو ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا، لیکن چونکہ بہ تبدیل الفاظ بالکل یہی بات دیوبند کے رسالہ میں شائع ہوتی ہے اور حدیث کی صورت میں جس کے راوی حضرت انسؓ اور مفسر علامہ سیوطی ہیں، اس لئے مسلمانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور یہ "زہر" "نوشِ جاں" بن کر رہ گیا ہے۔ یہ ہے ہماری کورانہ تقلید کا عالم اور یہ ہے وہ بلا جو احادیث کی بدولت اسلام پر مسلط ہوئی ہے ــــ ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اُصول بدل جائیں، ممکن ہے کہ رسول اللہ کے اخلاق وہ نہ رہیں جو ایک رسول کے ہونے چاہئیں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ حضرت ابوہریرہ اور جناب انس کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی کذب و مبالغہ کا گمان ہو سکے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی حالتِ زار

جب کوئی قوم انحطاط کی منزل سے گزرتی ہے تو اسکی قومیت کے عناصر، اس کی اجتماعیت کے اُصول، اسکے ادارہائے علم و تہذیب سب درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان چونکہ آج کل اسی منزل سے گزر رہے ہیں اس لئے اگر اُن کے ہر نظام میں اختلال و اضمحلال نظر آتا ہے تو حیرت کی کیا بات ہے؟

دارالعلوم ندوہ اپنی عمر، اپنے مقاصد کے لحاظ سے کافی شہرت حاصل کر چکا ہے، (گو اعمال و نتائج سے اس کی تصدیق نہ ہوتی ہو) اور مذہبی و علمی درسگاہ ہونے کی حیثیت سے بھی کافی مشہور رہے (گو اسکی مذہبی تعلیم احادیث پرستی اور علمی سرگرمی قدماء کی گورکنی سے آگے نہ بڑھی ہو) لیکن ملک کے عام ذہنی انقلاب سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا اور وہی دارالعلوم ندوہ جس میں کسی وقت طلبہ کی کثرت سے چہل پہل نظر آتی تھی اب زیادہ سے زیادہ سوا سو طالب علموں کی تربیت کا ذمہ دار ہے۔ مسلمانوں کی آٹھ کروڑ آبادی کو دیکھئے اور اس تعداد کو۔ ممکن ہے ارباب ندوہ محسوس نہ کریں، لیکن حقیقتاً اس سے زیادہ شرمناک بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ جس ادارۂ تعلیم کے قیام کو تقریباً پچاس سال ہو چکے ہوں اور جس کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں سے بلا مبالغہ اسوقت تک لاکھوں روپیہ وصول کیا گیا ہو، اس کی بے بضاعتی اور اس کے ناکارہ ہونے کا یہ عالم ہو کہ زیادہ سے زیادہ اوسط طلبہ کا سو سے آگے نہ بڑھے اور جب امتحان ہو تو سب سے اونچے درجے میں ایک طالب علم بھی کامیاب نہ ہو سکے[1]

[1] ۱۹۳۴ء میں امتحان سالانہ کا نتیجہ ملاحظہ ہو:- درجہ اول میں کُل ۱۱ طالب علم تھے جن میں صرف سات شریک ہوئے اور ۴

اس وقت میں اس مسئلہ پر گفتگو کرنا نہیں چاہتا کہ وہاں کی تعلیم کس حد تک بے نتیجہ ہے یا یہ کہ وہاں کے نصاب میں کتنی فرسودگی و قدامت پرستی پائی جاتی ہے کیونکہ یہ داستان جتنی دردناک ہے اتنی ہی طویل بھی ہے۔ بلکہ اسوقت پیشِ نظر صرف وہاں کے نظام و اہتمام کی ابتری ہے، جس کا ذکر ندوہ کی چار دیواری سے گزر کر (باوجود انتہائی کوشش کے) لوگوں کی زبانوں پر اور اخباروں کے صفحات پر بھی آجاتا ہے، چنانچہ حال ہی کی بات ہے کہ وہاں کے ارکان اہتمام نے تین طلبہ کو بعض ایسی شکایتوں پر جن کے لئے ان کے پاس معقول عذر تھے ندوہ سے نکال دیا اور جب تک عام اسٹرایک کی صورت پیدا ہو کر مقامی اخبارات میں اس کا چرچا شروع نہ ہوا، ان کو دوبارہ داخل ہونے کی اجازت نہ دی گئی۔

چونکہ دارالعلوم ندوہ میں اکثر و بیشتر طلبہ باہر کے ہیں اس لئے وہ دارالاقامہ میں رہتے ہیں اور انکی زندگی کے تمام مشاغل کا مرکز وہیں کی سرزمین ہے۔ ایسی صورت میں جب تک ارکان اہتمام و طلبہ میں باہمگر اعتماد کی کیفیت پیدا نہ ہو، تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہ سکتے اور نہ انتظام میں استواری پیدا ہو سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دارالعلوم ندوہ کے طلبہ مکتب کے بچے تو ہیں نہیں کہ آپ کان پکڑ کے "دلے بزندش" کے اُصول پر اُن سے کام لے سکیں، وہ نوجوان طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ان میں موجود ہے۔ غیرت و خودداری کا احساس بھی رکھتے ہیں اس لئے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے سختی و تشدد درکار نہیں بلکہ نفسیات شناسی اور حکمت عمل کی ضرورت ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ وہاں کے ارکان اہتمام غیر معمولی ناجائز سختی سے کام لیتے ہیں (جیسا کہ بعض باتوں سے ثابت بھی ہوتا ہے) تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ انھوں نے حد درجہ غیر دانشمندانہ اُصول اختیار کیا ہے۔

ایک عام شکایت یہ ہے کہ جب سے جدید ارکان اہتمام آئے ہیں، جرمانوں کی کثرت ہوگئی ہے اور یہ طلبہ کو ناگوار ہونا چاہئے، نہ صرف اس لئے کہ ان میں سے اکثر جرمانہ ادا کرنے کے ناقابل ہوں گے، بلکہ اس بناء پر بھی کہ اس کا اخلاق پر بہت خراب اثر پڑتا ہے اور اسی لئے شرعاً تعزیر بالمال جایز نہیں۔ حیرت ہے کہ ارباب ندوہ نے جو ہر بات کو خالص شریعت اسلامی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کیونکر ایسی

صہ۔ تین پاس۔ درجۂ دوم میں چودہ طالب علم اور پانچ کامیاب۔ درجۂ سوم میں بارہ طالب علم اور چار کامیاب۔ درجۂ چہارم کے سترہ طلبہ میں صرف چھ کامیاب۔ درجۂ پنجم کے نو طلبہ میں پانچ کامیاب۔ درجۂ ششم میں سولہ طلبہ اور صرف دو کامیاب۔ ہفتم میں کُل چار طالب علم، کامیاب کوئی نہیں، ہشتم میں نو طلبہ اور چار کامیاب۔ نہم میں چونکہ کوئی کامیاب نہیں ہوا اس لئے اس کا نتیجہ بھی رجسٹر میں درج نہیں کیا گیا۔

غیر شرعی تعزیر کو جاری کرنا پسند کیا۔

ہم کو ماہ اگست ۳۵ء کے جرمانوں کی جو فہرست موصول ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک مہینہ میں طلبہ پر دو پیسے سے لیکر عہ تک تعزیر جرمانہ جاری ہوئی اور اس طرح تقریباً سترہ روپیہ کا مطالبہ عاید کیا گیا۔ (وصولی کا حال معلوم نہیں)

یقیناً ایک دار العلوم کے لئے سترہ روپیہ ماہوار جرمانہ کوئی ایسی بڑی رقم نہیں ہے لیکن جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سو، سوا سو طالب علموں میں سے ستر طالب علم جرمانہ کے مستحق سمجھے گئے تو اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یا تو سوء اتفاق سے امسال طلبہ ہی میں حد درجہ سرکشی پیدا ہو گئی ہے، یا یہ کہ دار العلوم کا نظم و اہتمام ناقص ہے اور وہ طلبہ پر کوئی اقتدار قائم نہیں کر سکا۔

مہتمم دار الاقامہ یا دار الاقامہ کے محرر کی طرف سے جو احکام اس دوران میں طلبہ کے نام جاری ہوئے ہیں، ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:۔

۱۔۔ داڑھی نہ منڈوائی جائے۔

۲۔۔ انگریزی وضع کے بال نہ رکھے جائیں۔

۳۔۔ نماز باجماعت ادا کی جائے۔

۴۔۔ صبح کی نماز کے بعد فوراً ورزش گاہ میں پہونچا جائے۔

۵۔۔ ۷ ½ بجے شام کے بعد سے مطالعہ شروع کر دیا جائے۔

۶۔۔ بغیر اجازت نامہ کے دار الاقامہ نہ چھوڑا جائے۔

ان احکام میں (سوائے اس حکم کے جو داڑھی اور بال سے تعلق رکھتا ہے) کوئی حکم ایسا نہیں ہے جسے بے محل یا ناجائز قرار دیا جائے، اور اگر طلبہ ان کی پابندی نہیں کرتے تو اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ دار الاقامہ کے مہتمم یا وہاں کے کسی ایسے کارکن سے اُن کو اختلاف ہے جو جرمانہ کی سختی سے اپنا استبداد قائم کرنا چاہتا ہے اور اپنی سیرت کے لحاظ سے اس قابل نہیں ہے کہ طلبہ پر کوئی اخلاقی دباؤ ڈال سکے۔

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نماز کا صحیح نتیجہ نماز باجماعت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، لیکن اگر طلبہ نے صرف تعزیر کے خوف سے اس کی پابندی کی تو بیکار ہے، ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ان کی ذہنیت میں ایسا انقلاب

لہ درجہ وار جرمانہ کی تفصیل یہ ہے:۔

درجۂ اول۔ (۱۹ طلبہ)۔ درجۂ دوم (۵)۔ درجۂ سوم (۱۱)۔ درجۂ چہارم (۱۲)۔ درجۂ پنجم (۱۴)۔ درجۂ ششم (۷)۔ درجۂ ہفتم (۲)

پیدا کیا جائے کہ وہ نماز باجماعت کی اہمیت کو خود محسوس کرنے لگیں اور بغیر کسی جبر و تخویف کے اس کے پابند ہو جائیں یہی حال دیگر احکام کا بھی ہے کہ اگر جبر و تشدد کے خوف سے طلبہ نے ان کی پابندی کی بھی تو کیا نتیجہ ہے۔

ایک دار التعلیم کا اولین فرض طلبہ کے دماغ و ذہن کو متاثر کرنا ہے اور اگر وہاں کے ادارۂ نظم و اہتمام میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو طلبہ کی سرکشی کے انسداد سے قبل یقیناً وہاں کے کانسٹی ٹیوشن کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ دار العلوم ندوہ کی مجلس انتظامیہ کن افراد پر مشتمل ہے اور ان کی ذہنیت کیا ہے، یہ مسئلہ بھی بجائے خود بہت توجہ طلب ہے۔ لیکن اس گفتگو کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی رکھتے ہوئے، اس وقت ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ناظم دار العلوم (جو تنہا مقامی ذمہ دار ہستی تمام نظم و نسق کی ہے) کس حد تک اس انتشار کا جوابدہ ہے۔ موجودہ ناظم (جناب ڈاکٹر عبد العلی صاحب) اس میں شک نہیں کہ اپنے اخلاق کے لحاظ سے نہایت برگزیدہ انسان ہیں، اس قدر برگزیدہ کہ ان کو دیکھتے ہی ایک شخص دستِ ارادت بڑھا دینے پر مجبور ہو سکتا ہے، اپنی نیک نفسی اور معصومیت کی حیثیت سے بھی وہ بلند مرتبہ رکھتے ہیں کہ اگر انسانوں کی جماعت میں کسی فرشتہ کی جستجو ہو تو لکھنؤ کی طرف سے ہم بلا تامل اُن کو پیش کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ایک ادارہ کے اہتمام کے لئے ہم کو ولی و فرشتہ کی ضرورت ہے یا ایک مصلحت بیں، دور اندیش، نفسیات داں ڈکٹیٹر کی جو اسی دنیا میں رہکر اسی دُنیا کے اُصول کو سمجھے اور انھیں کے مطابق اپنے شخصی اثر سے کام لیکر ایک خاص دستور العمل پر عمل کرنے کے لئے لوگوں کو مجبور کر سکے۔

موجودہ ناظم ندوہ شہر کے کامیاب ڈاکٹروں میں سے ہیں اور ایک کامیاب ڈاکٹر کے معنی یہ ہیں کہ شب و روز میں کوئی ساعت اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ مریضوں کی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ یوں بھی ندوہ کے کاموں پر پوری توجہ کرنے سے معذور رہیں اور مجبور ہیں کہ وہ اپنے ماتحت کارکنوں ہی کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھیں اور انھیں کے کانوں سے سنیں۔

ایسے اداروں میں جن کی مالی حالت اچھی ہے، کسی اعزازی ناظم کا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہمیشہ وہی شخص اہتمام کا ذمہ دار ہو سکتا ہے جو اپنا پورا وقت صرف کرے اور جس کو کافی معاوضہ دیا جائے۔ ایسی صورت میں کہ موجودہ ناظم نہ اپنا پورا وقت صرف کر سکتے ہیں اور نہ کوئی حق الخدمت ان کو ملتا ہے، ان سے باز پرس کی کوئی صورت نہیں اور زیادہ سے زیادہ ہم ان کی خدمت میں یہی اپیل کر سکتے ہیں کہ اگر وہ بھی واقعی اپنے آپ کو اس عظیم ذمہ داری لینے کا اہل نہیں سمجھتے تو ان کو چاہئے کہ وہ اس خدمت سے اپنی سبکدوشی کا اعلان کر دیں اور اس بدنامی سے بچیں جو بہ حیثیت ناظم ہونے کی اُن پر عاید ہوتی ہیں۔

(بقیہ ملاحظات صفحہ ۶۷ پر ملاحظہ کیجئے)

نجوم کے بعض تاریخی و علمی مباحث

اور

قصاید خاقانی میں منجمانہ اشارات

(مسلسل)

قبل اس کے کہ قصاید خاقانی کے ان اجزاء پر روشنی ڈالی جائے جن میں شاعر نے منجمانہ اشارات کئے ہیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود شاعر کے بعض نقوش زندگی پیش کر دئے جائیں۔

نام و نسب تذکرہ و تاریخ کی کتابیں تو خاقانی کے حالات سے بھری ہیں لیکن خود شاعر نے بھی قصاید میں اپنے نج کے حالات درج کر دئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ تذکرہ نگاروں کی روایات لیتے ہوئے خود قصاید کے وہ اجزا بھی پیش کر دئے جائیں، جن میں شاعر نے اپنی زندگی کے اہم پہلوؤں کی طرف اشارے کئے ہیں

آپ کا نام افضل الدین ابراہیم اور کنیت ابوبدیل تھی، عرفی پہلے صیدی اور غالب اسد تخلص کرتے تھے اسی طرح خاقانی نے پہلے اپنا تخلص "حقایقی" رکھا تھا خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ کی ملازمت کی تو حقایقی ترک کر کے "خاقانی" تخلص اختیار کیا اپنے نسب و حسب کے متعلق اس نے خود ہی چند قصیدوں میں تذکرہ کیا ہے خاقانی نے اپنے اعمال زندگی سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان جس فضا میں بھی پیدا ہو اس کے لئے میدان ترقی موجود ہے ارادہ کی استواری، ذوق کی پاکیزگی اور سعی و طلب کی فراخ دامانی اس کو یقیناً پستی سے بلندی پر پہونچا کر رہے گی، شہر شروان میں ایک بڑھئی کے گھر میں پیدا ہوئے لیکن علم و فضل اور ہمت و حوصلا نے آخر شاہی دربار میں زریں کرسی پر بٹھا دیا۔

چنانچہ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل لکھتے ہیں :-

بمرور ایام قربت و منادمت خاقانی در حضرت سلطانی بجائے رسید کہ در حضور کرسی طلائی نشست[1]

خاقانی کی زندگی ایک غریب اور غیر مشہور خاندان کے فرد کیلئے بہت کچھ سبق آموز ہے ہندوستان کے اندر اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اول تو ایسے افراد جن کی پرورش و تربیت اس نوع کی پست فضاؤں میں ہوئی ہو وہ اپنے اندر اُبھرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے اور جو اتفاقاً اُبھر جاتے ہیں وہ اپنا نسب نامہ افراسیاب یا ہلاکو و چنگیز تک پہونچا دیتے ہیں رفتہ رفتہ لوگ ان کی اصل کو بھول جاتے ہیں اور غیر آبا کی نسبت سے ایسے حضرات کو بھی اعزاز و شہرت حاصل ہو جاتی ہے اس نوع کی ترقی در اصل قومی ترقی نہیں بلکہ انفرادی خود کامی ہے، جسکی عفونت ہماری ہیئت اجتماعیہ میں مہلک جراثیم پیدا کر تی جاتی ہے اگر ایسے افراد خود غرضانہ فراموش کاری سے کام نہ لیں تو ہماری قومی زندگی میں بہت سے آثار جمیل پیدا ہو سکتے ہیں دیکھئے خاقانی کی جرأت اخلاق علم و فضل جاہ و ثروت، امارت و سیادت کے بعد نہ تو وہ ہاشمی بنا نہ قریشی بلکہ خود بہ بانگ دہل کہتا ہے:۔

از یکے سو چوں خلیل اللہ درودگر زادہ ام — بود خواہر گیر عیسیٰ مادر ترسائے من

یعنی باپ کی طرف سے تو میں بڑھئی ہوں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے حضرت خلیل اللہ بھی تو آذر بت تراش کے بیٹے تھے، اسی طرح میری ماں ترسا (آتش پرست) تھی، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے حضرت عیسیٰ کی منھ بولی (خواہر گیر) بہن بھی تو ترسا ہی تھی۔

ایک دوسرے قصیدہ میں لکھتا ہے:۔

شیخ مہندس لقب پیر درودگر علی — کاذر و اقلیدس اند عاجز برہان او

یوسف نجار کیست نوح درودگر کہ بود — تا زہنر دم زنند بر در دوکان او

خاقانی نے صرف یہی اقرار نہیں کیا کہ ان کے باپ بڑھئی کا پیشہ کرتے تھے، بلکہ اپنے پیشہ کی شرافت اور اپنے باپ کی صناعانہ مہارت پر بھی زور دیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ علی نجار اپنے پیشہ میں بہت بڑا کمال رکھتے ہیں ایسا کمال کہ آذر کی بت تراشی اور اقلیدس کی ریاضی دانی بھی اس کے سامنے ہیچ ہے، میرا باپ اتنا بڑا ماہر درودگر ہے کہ یوسف نجار (بی بی مریم کا منگیتر) اور حضرت نوح اپنی ملہانہ فنی استعداد کے باوجود میرے باپ کی دوکان پر اس فن کے متعلق زبان نہیں ہلا سکتے۔

ولادت خاقانی کا وہ زمانہ تھا جبکہ خلافت بغداد پر زوال آچکا تھا ایک طرف اتابکان موصل کا اقتدار تھا، دوسری طرف سلجوقیہ اصفہان بر سر عروج تھے، نور الدین محمود اور صلاح الدین ایوبی

---

[1] صحف ابراہیم

مشرق اور مغرب میں زور آزمائیاں کر رہے تھے، خلافت عباسیہ المستضئی بنور اللہ کے زیرنگین تھی، یہی وجہ ہے کہ کلیات خاقانی کے اندر خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ، محمد بن ملکشاہ سلجوقی، اتابک مظفر الدین قزل ارسلان اور خلیفہ عباسی المستضئی کی مدح میں بھی قصیدے پائے جاتے ہیں۔

ہمارے پیش نظر اس وقت تذکرہ دولت شاہ سمرقندی، صحف ابراہیم مصنفہ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل، مجالس المومنین سید نور اللہ شوستری، روضۃ الصفا، تاریخ مظفری، نفحات الانس اور خلاصۃ الافکار ابوطالب اصفہانی ہیں جن میں خاقانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، لیکن ان میں سے کسی کتاب میں خاقانی کی تاریخ ولادت مذکور نہیں محمد بن خوند شاہ نے سلطان سنجر کے ضمن میں خاقانی کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے پہلے قوم غزان پر سلطان سنجر کے عملہ کی زیادتیوں کا حال لکھا ہے پھر اس قوم کے خروج وطغیان کا تذکرہ ہے، سلطان سنجر کی گرفتاری، مرو کی تباہی اور خراسان کی تخریب کا نقشہ کھینچا ہے اسی ضمن میں فرماتے ہیں:-

علماء ومشایخ واکابر خراسان بہ تعذیب آں طاغین گرفتار شدہ درجہ شہادت یافتند از انجملہ محمد بن یحیٰی راکہ فاضل متقی وعالم متورع بود بہ شکنجہ خاک ہلاک کردند خاقانی در شانش گوید

اس کے بعد مورخ موصوف نے خاقانی کے قصیدہ کے دو بیت نقل کئے ہیں:-

در ملت محمد مرسل نداشت کس　　　　فاضل تراز محمد یحیٰی فنائے خاک
آں کردہ روز تہلکہ دنداں فدائے سنگ　　　　ایں کردہ گاہ قتل دہاں را فدائے خاک

غزوہ تبوک میں آنحضرت کا دندان مبارک شہید ہوگیا تھا، اسی طرف اشارہ ہے یعنی احمد مجتبیٰ صلعم کا دندان مبارک تبوک کی لڑائی میں شہید ہوا تخریب خراسان کے دن محمد بن یحیٰی کا چہرہ خاک وخون میں آلودہ ہوا محمد بن خوند شاہ نے بس اسی قدر اقتباس پر ختم کیا ہے خاقانی نے اس قصیدہ میں محمد بن یحیٰی کی شخصیت پر اور بھی روشنی ڈالی ہے۔

گفتی کہ بے محمد یحیٰی بہ ماتم اند　　　　از قبہ ثوابت تا منتہائے خاک
باعطر پاسئے روضہ پاکش عجب مدار　　　　کز طوبی بہشت برآرد گیائے خاک

سنجر بسعی دولت او بود دوستے　　　　بادا نسیاستش شدہ مہر آزمائے خاک
بے فر او چہ سنجر وتسلیم سنجری　　　　بے بادشاہ دیں چہ بود بادشائے خاک

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خاقانی محمد بن یحیٰی کے معاصر تھے، محمد یحیٰی سلطان سنجر بن ملک شاہ سلجوقی کے

کے عہد میں گزرے ہیں اور چونکہ سلطان سنجر کی ولادت ۴۷۹ھ اور وفات ۵۵۲ھ میں ہوئی اس لئے خوندشاہ کی روایت کے مطابق خاقانی کے عہد سخن سنجی و طبع آزمائی کی تو تعیین ہوجاتی ہے لیکن اس سے ولادت کی تاریخ متعین نہیں ہو سکتی، خاقانی کی وفات کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے، مولانا جامی نے گول مول لکھدیا ہے۔

در زمان خلافت المستضئی بنور اللہ بودہ است و قصیدہ عربی کہ در مدح بغداد گفتہ ذکر دے کردہ و توفی المستضئی سنہ خمس و تسعین و خمسمایہ[1]

مولانا جامی نے خاقانی کے زمانہ کی تعیین اس کے عربی قصیدہ سے کی ہے جو اس نے بغداد کی تعریف میں کہی ہے، اور اس میں خلیفہ المستضئی بنور اللہ کا تذکرہ کیا ہے عربی قصیدہ کے علاوہ خاقانی نے فارسی میں بھی المستضئی کی مدح کی ہے. فرماتے ہیں:-

من بہ بغداد و ہمہ آفاق خاقانی طلب نام خاقانی طراز فخر خاقان آمدہ
مہدی آخر زماں المستضئی باللہ کہ ہست خاک درگاہش بہشت عدن عدنان آمدہ

یہ فارسی قصیدہ بھی طویل ہے۔

جامی کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ۵۹۵ھ میں المستضئی نے وفات پائی اس لئے گویا خاقانی کی وفات کا زمانہ بھی اسی کے لگ بھگ ہے خلیفہ المستضئی کی وفات کی تاریخ ۵۹۵ھ نہیں ہے، بلکہ ۵۷۵ھ ہے، "نفحات" کا ایک عمدہ قلمی نسخہ "پٹنہ اورینٹل لائبریری" میں ہے اس میں بھی ۵۹۵ھ ہی درج ہے نفحات میں بعض تاریخی غلطیاں موجود ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے مولانا جامی سے سہو ہوگیا، بہر حال جامی کی روایت سے بھی صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ خاقانی خلیفہ المستضئی کے معاصر تھے، اور اس لئے چھٹی صدی کے آخر میں انھوں نے بھی وفات کی ہوگی۔

عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:-

وفاتش بہ قول بعضی پانصد و ہشتاد و دو ہجری و بہ قول دولت شاہ پانصد و ہشتاد و ہشت است[2]

عزیز الملک کی یہ روایت صحیح نہیں کہ دولت شاہ سمرقندی نے وفات کی تاریخ ۵۸۸ھ لکھی ہے بلکہ انھوں نے بھی ۵۸۲ھ ہی لکھا ہے، اور یہی تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے ابوطالب اصفہانی وفات کی تاریخ ۵۹۵ھ بتاتے ہیں ان کو غالباً نفحات کی عبارت سے غلط فہمی پیدا ہوگئی۔

---

[1] نفحات الانس [2] صحف ابراہیم

ان تمام تاریخی واقعات کی موجودگی میں یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ خاقانی کس زمانہ میں پیدا ہوئے اور اس عہد میں کونسی علمی وسیاسی فضا تھی، لیکن پھر بھی ولادت کی صحیح تاریخ نہیں معلوم ہوئی، خاقانی نے اپنے مختلف قصاید ومراثی میں سنہ وتاریخ کے بعض اشارے کئے ہیں جن سے نتائج مترتب ہو سکتے ہیں امیر رشید کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

طویلہ بخشش سی ویک جواہر داشت   نہادمش بہ بہائے ہزار ویک اسمار

بہ سال عمر از وبست وپنج بخریدم ......

امیر رشید نے خاقانی کی تعریف میں ۳۱ ابیات کا ایک قصیدہ کہا تھا خاقانی کہتے ہیں ان ۳۱ ابیات میں سے پچیس بیت تو میں نے اپنی عمر کی مدت سے خرید کیا یعنی وہ اس وقت پچیس سال کے تھے، اور بقیہ چھ ابیات کی قیمت چھ دن (سنیچر اتوار وغیرہ) ہیں ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

کاندر سنہ ثون اختر سعد   در طالع کامراں بہ بینم

"سنہ ثون" سے مطلب ۵۵۰ھ ہے یعنی مشتری ۵۵۰ھ میں برج اسد میں ہوگا۔

اس سلسلہ میں اور بھی ابیات ہیں جو اس عہد کے ایک فلکی حادثہ اور قران سبعہ سیارہ سے متعلق ہے جسکی تفصیل آگے آتی ہے اس بیت سے اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ ۵۵۰ھ میں وہ ۲۵ سال کے تھے، چونکہ بروایت صحیح انھوں نے ۵۸۲ھ میں وفات کی اس لئے نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی ولادت ۵۲۵ھ یا اسی کے لگ بھگ ہوئی، اور تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں انھوں نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔

وطن اپنے وطن اور مولد کے متعلق خود انھوں نے کہا ہے۔

پردہ فقرم مشیمہ دست لطفم قابلہ   خاک شروان مولد ودارالادب منشاے من

یعنی شروان میں پیدا ہوئے، اور "دارالادب" میں پرورش پائی، اس عہد میں "دارالادب" کون سا شہر تھا؟ موصل، بغداد، اصفہان، تینوں شہر اس وقت مرجع افاضل تھے، خصوصاً بغداد کو زیادہ اہمیت حاصل تھی، ہرچند عباسیہ کی حکومت زوال پذیر تھی، ہاں سلجوقیہ کی بدولت اصفہان کا ستارہ اوج پر تھا، اور غالباً "دارالادب" سے "اصفہان" ہی مراد ہے اصفہان اور شیراز کو شروع ہی سے اہمیت حاصل ہے قرب وجوار اور دور دست مقامات سے اکثر طلبہ یہیں آکر تعلیم حاصل کرتے تھے، چنانچہ شیخ علی حزیں کا مولد "لاہجان" تھا لیکن انھوں نے اصفہان ہی میں پرورش پائی اور اسی رعایت سے اصفہانی مشہور ہیں، خاقانی کا مولد شروان ہے لیکن اس سے وہ بہت بیزار نظر آتے ہیں چند قصاید میں انھوں نے اپنے وطن اور یاران وطن کی مذمت کی ہی چنانچہ فرماتے ہیں

خاک شرواں مومیائے بخشش ایران آمدہ   من شکستہ خاطر از شروانیان وزلفظ من

اس میں شک نہیں ایران کے مشہور بلاد خراسان و اصفہان، شیراز و تبریز، کی طرح شروان کو بھی شہرۂ آفاق بنانے والا، یہی خاقانی تھا، لیکن خود شاعر اس سے شکستہ خاطر رہا یہی نہیں بلکہ ارباب وطن بھی ان سے آزردہ رہا کرتے تھے، خود کہتے ہیں:۔

قوت عرق عراق از مایۂ طبع من است　　　گرچہ شریان دل شروانیان را نشترم

یعنی گو اہل شروان کی رگ (شریان) کے لئے میرا وجود نشتر ہے، لیکن عراق کی رگ کو میری طبع عالی سے قوت ہے۔

وطن اور ارباب وطن سے یہ بیزاری اس قدر بڑھی کہ شروان چمن خزاں رسیدہ کی طرح بالکل بے کیف اور بے آب و رنگ نظر آنے لگا، فرماتے ہیں۔

زاں پیشتر کاجل ز جہاں دار ہاندش　　　از ننگ نحس خانہ شروانش وا رہاں

خیر یہ تو مختلف قصاید کے چند ابیات ہیں انھوں نے شروان کی مذمت میں مسلسل شعر کہے ہیں مگر اسی کے ساتھ بعض جگہ مصالحت کی بھی کوشش کی ہے اور حب وطن کا ثبوت دیا ہے فرماتے ہیں:۔

فخر من یاد کرد شروان بہ　　　کہ مباہات خور بہ باختر است
لیک تبریز بہ اقامت را　　　کہ صدف قطب را بہی مقر است
ہم بہ مولد قرار نتواں کرد　　　کہ صدف حبس خانہ درر است
گرچہ تبریز شہرہ تر شہریست　　　لیک شروان شریف تر شہر است
خاک شروان مگو کہ آن شریست　　　کار شروان بخیر شہر است
عیب شرواں مکن کہ خاقانی　　　ہست زاں شہر کا بتداش شر است
عیب شروان چرا کنی بدحرف　　　کا دل شرع در آخر بشر است

کسی چیز کی طرف سے دل میں مخالفانہ جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر ہزار ظاہر دارانہ خلوص و ارتباط کا اظہار کیجئے، اصل جذبہ آشکارا ہو ہی جائے گا وطن کی تعریف کر رہے ہیں لیکن چونکہ دل بیزار ہے اس لئے بے اختیارانہ مذمت میں بھی چند کلمات نکل پڑتے ہیں فرماتے ہیں کہ لفظ "شروان" کی ابتدا لفظ "شر" سے ہے اس لئے اس کا عیب بیان کرنا فضول ہے، حالانکہ اس نوع کے اظہار خیال کا یہ موقعہ نہ تھا۔

اب آیئے ذرا جستجو کی جائے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر خاقانی کو وطن سے بیزاری تھی، اور اہل وطن بھی اس سے ناخوش تھے، شاعر کی نازک مزاجیاں مشہور ہیں۔ خاقانی اس سے مبرا نہ تھے، لیکن حزیں کی طرح زود رنج اور غضب کوش بھی نہ تھے، معلوم ہوتا ہے کم سنی میں شعر و سخن کی ابتدا رگی، اور

بہت جلد فروغ حاصل کرلیا اہل وطن کے لئے یہی ایک قابل رشک بات تھی، بالخصوص حریفوں سے دیکھا نہ گیا اس پر خود شاعر کی سخن گسترانہ طبع آزمائیاں مستزاد تھیں کشمکش شروع ہوئی عرفی کی طرح ارباب وطن نے ان کو بھی کچھ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا شاعر تھے جوانی کے ولولے تھے، طبیعت میں زور تھا وطن کی ہجو لکھ ڈالی اب کیا تھا چاروں طرف سے ہنگامہ شروع ہوا، یہی وجہ ہے کہ قصاید میں خاقانی نے وطن سے بیزاری کا اظہار کیا ہے، اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل ابیات قابل غور ہیں۔

ز خاقانی ایں منطق الطیر بشنو　　　کہ چوں او معانی سرائے نہ بینی

خسرو صاحب خراج بر سر عالم توئی　　　بندہ بہ دور تو ہست شاعر صاحبقراں

ازیں قصیدہ کہ گفتم سخنوران جہاں　　　بہ حیرت اندچو از منطق الطیر غراب
زہے تمیمہ حسان ثابت و اعشیٰ　　　زہے نتیجہ سحبانِ وایل و عتاب

ایک نوجوان شاعر کی ان تعلی نوازیوں نے حاسدان وطن کو ابھارا وطنی شعرا میں ایک جماعت "روشنان" موجود تھی، انھوں نے "خاقانی تاریک" کا خطاب دیدیا، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

روشنان خاقانی تاریک خوانندم ولیک　　　صافیم خواں چوں صفائے صوفیاں راچاکرم

وطنی شعرا کے لئے یہی کیا کم تھا کہ انھوں نے خود کو شاعر صاحبقراں کہا حسان بن ثابت (اسلامی شاعر) اور "اعشیٰ" کی شاعری کو انجام تک پہونچانے والا بتایا اپنے کلام کو سحبان بن وایل اور عتاب کی شاعری کا نچوڑ کہا لیکن اب شاعر نے خود زیادتی شروع کی، اور عرفی نے جس طرح ابوالفرج اور انوری سے اپنے کو بالاتر بتاکر ایرانیوں کو رنجیدہ کر دیا اسی طرح خاقانی بھی سنائی جیسے صوفی شاعر اور معزی اور عنصری جیسے باکمال سخنوروں کو اپنے خیال میں نہ لائے، فرماتے ہیں:۔

ازیں شعر خجلت رسد عنصری را　　　دگر عنصری جان حسان نماند

ایران بہ تو شد حسرت غزنین و خراساں　　　چوں گفتہ من رشک معزی و سنائی

ایں شعر ہر کہ بشنود از شاعران عصر　　　زہرہ ز رشک صاحب انشا بر افگند
گو عنصری کہ بشنود ایں شعر آبدار　　　تا خاک بر دہان مجاز ا برافگند

"مجاذا" ایک شاعر کا تخلص ہے جو خاقانی کا حریف اور دشمن تھا، ان ابیات کے علاوہ خاقانی کے قصائد میں تعلّی کے اور بہت سے اشعار ہیں اور یہ سب اُن کے عہد شباب کی جولانیٔ فکر کا نتیجہ ہیں۔

تعلیم و تربیت

قصائد خاقانی کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم کو اس کے تبحر علمیہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منقولات اور معقولات کی تمام اصناف پر اس کو یکساں عبور تھا، علوم مذہبی کے علاوہ فلسفہ و تصوف تاریخ و خرافیات، موسیقی و نجوم وہ سب کچھ جانتا تھا خصوصاً نجوم و شاعری سے تو اس کو عشق تھا، ہرچند اس کا باپ ایک بڑھئی تھا اور کس کو توقع ہو سکتی تھی کہ علی نجار شروانی کے گھر میں خاقانی جیسا مہر درخشاں طلوع ہوگا جس کی شعاعیں نہ صرف ایران بلکہ ایک عالم کو خیرہ بنا دیں گی، یوں تو خاقانی نے فخریہ "ازیکے سو چوں خلیل اللہ در وگر زادہ ام" لکھا ہے، لیکن اس کے خاندان والے علوم و فنون میں سرعت کے ساتھ ترقی کر رہے تھے، چنانچہ اس کے چچا علامہ اجل اور حکیم بے بدل تھے، خاقانی نے ان کی وفات پر کئی دردانگیز مرثئے لکھے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

حیات بخشا در خامی سخن منگر — کہ سوختہ شدم از مرگ قدوۃ الحکما
شکستہ دل تر از آں ساغر بلورینم — کہ در میانہ خارا کنی ز دست رہا
فروغ فکر و صفائے ضمیرم از عم بود — چوں عم بمرد ببرد آں ہمہ فروغ و صفا

ان ابیات سے معلوم ہوتا ہے خاقانی کے چچا کو "قدوۃ الحکما" کا لقب ملا تھا اور انھیں نے ابتداً خاقانی کی تعلیم و تربیت بھی کی تھی، دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

کو آنکہ ولی نعمت من بود عم من — عم چہ کہ پدر بود و خداوند بہر باب
آں فخر من مفتخر ماضی و اسلاف — آں صدر من و مصدر مستقبل و اعقاب
آں خاتمۂ کار مرا خاتم دولت — آں فاتحۂ طبع مرا فاتح ابواب
از دولت عم بود ہمہ مادت طبعم — آری ز دماغ است ہمہ قوت اعصاب

ابیات بالا سے واضح ہوتا ہے کہ خاقانی نے ابتدائی تعلیم تو اپنے چچا سے حاصل کی ہی تھی، پہلے پہل مشق سخن بھی اس نے اپنے چچا ہی کے سامنے کی اسی طرح خاقانی کے چچا زاد بھائی خواجہ امام وحید الدین تھے جن کی وفات پر شاعر نے پر درد مرثیہ لکھا جو اس کی اہلی زندگی کو بہت کچھ نمایاں کرتا ہے اس کے پڑھنے کے بعد ہمیں شبلی کا فاجعہ انگیز مرثیہ (Elegy) یاد آجاتا ہے،

تذکرہ نگاروں نے اس طرف توجہ نہیں کی ہے کہ ابتداً خاقانی کا مربی اور معلم کون تھا لیکن اس کے قصائد سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کے چچا نے جو علامہ اور فیلسوف تھے، اس کی تربیت کی اور ابتداً

فنون شعری سے انھیں نے اس کو باخبر کیا خاقانی نے اپنے چچا کے علاوہ اپنے اور دو اُستادوں کا تذکرہ کیا ہے، ایک تو "فاضل سادی" اور دوسرے بہاؤالدین سعید بن احمد، اول الذکر ہیئت و منطق میں ید طولی رکھتے تھے، اور معقولات میں خاقانی کے اُستاد تھے، فرماتے ہیں:۔

گنج فضایل افضل سادی شناس و بس | کز علم مطلق آیت دوراں شناسمش
اُستاد حکمت من و شاگرد حکم دین | کز چند فن فلاطن یوناں شناسمش

اسی طرح سعید بن احمد کے متعلق لکھتے ہیں:۔

کلیم طور مکارم اجل بہاؤالدین | کہ مدح اوست مسیحائے جان بیمارم
سزائے حمد و محامد سعید بن احمد | کہ خاک درگہش افزود آب بازارم

خاقانی کے تمام سوانح نگاروں نے اس کو ابوالعلاء گنجوی کا شاگرد بتایا ہے مگر کسی نے نہ تو اس کے ابتدائی معلم قدوۃ الحکما کا تذکرہ کیا جو اس کے چچا بھی تھے، اور نہ فاضل سادی اور سعید بن احمد کا حال لکھا مولانا جامی لکھتے ہیں:۔

ہر چند وے شاگرد فلکی شاعر است و بہ شعر شہرت تام یافتہ چنیں گویند کہ ویرا طور شعر طور دیگر بودہ است کہ شعر در جنب آں کم بودہ۔[1]

جامی کی روایت کے اس حصہ "وے را طور شعر طور دیگر بودہ" کی شرح آگے آتی ہے لیکن یہاں صرف فلکی سے بحث کی جاتی ہے جامی نے فلکی کو خاقانی کا اُستاد بتایا ہے حالانکہ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل ابوالعلاء گنجوی کو خاقانی کا اُستاد بتاتے ہیں اور صاحب تاریخ مظفری کی روایت کے مطابق فلکی بھی ابوالعلاء گنجوی کا شاگرد تھا، فلکی شروانی پر انگریزی زبان میں حال ہی میں ایک کتاب ہندوستان کے ایک عالم نے لکھی ہے خاقانی نے اپنے قصائد میں اس قدر کثرت سے کیوں منجمانہ اشارات کئے ہیں اس کا جواب خود "فلکی" ہے تخلص ہی بتا رہا ہے، کہ فلکی کو ہیئت و نجوم سے شغف تھا اسی کا اثر خاقانی پر پڑا، یا دونوں ہم مشق شاعروں میں ایک ہی اثرات کے ماتحت نجوم کا ذوق پیدا ہو گیا ہو فلکی تخلص اور خاقانی کے منجمانہ اشارات سے قیاس کیا جاتا ہے، کہ اس عہد میں فارسی شاعری کا کیا رنگ تھا اور سلاطین اسلام نجوم سے کیا دلچسپی لے رہے تھے۔

ابوالعلاء گنجوی نے خاقانی کو منوچہر شروان شاہ کے دربار تک پہونچایا بوڑھا اُستاد اپنے شاگرد کو اسقدر عزیز رکھتا تھا کہ اس نے اپنی دختر سے اس کا عقد کر دیا لیکن شاعروں میں نباہ ہونا ذرا مشکل ہے یا دونوں نے

---

[1] نفحات الانس جامی

دونوں کے کان بھرنا شروع کئے نتیجہ یہ ہوا کہ بروایت صحف ابراہیم دونوں کے درمیان دشمنی پیدا ہوگئی اور "اہاجی رکیکہ" کا تبادلہ ہوا

خاقانی اور ابوالعلاء گنجوی کی نزاع کے سلسلہ میں یہ واقعہ غالباً دلچسپی سے سنا جائے گا کہ ابوالعلاء گنجوی نے جب اپنی لڑکی خاقانی سے بیاہ دی تو فلکی شروانی کو اس کا بیحد رنج ہوا، اُستاد کو پتہ چلا تو اس نے اس کو بیس ہزار درم دئے، اور کہا کہ یہ چالیس ترکی لونڈیوں کی قیمت ہے، جو حسن و صباحت میں ہماری لڑکی سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ ہوں گی۔

ابوالعلاء گنجوی منوچہر شروان شاہ کے دربار میں "ملک الشعرا" کے عہدہ پر فایز تھا خاقانی کا رسوخ ہوا تو وہ اپنے اُستاد کے سامنے شاگردانہ فقادگی کی بجائے سر دئے رہنے لگا، اُستاد کو اس کا رنج ہوا خاقانی کو جوانی کی اُمنگ تھی، اُستاد کی ہجو کہہ ڈالی، ابوالعلاء کے مفصلہ ذیل اشعار اس سلسلہ میں بیحد اثر آفرین ہیں۔

از آب دیدہ نخل قدش پرورش گرفت چندانکہ ہمچوں شاخ گل از ناز سرکشید
چوں طفل اشک عاقبت آں شوخ بیوفا از چشم من برامد و بر روئے من دوید[1]

سیر و سیاحت

مشکل ہی سے ایران کا کوئی ایسا شاعر ہوگا جس کو ذوق سیاحی نہ ہو اور اس نے مختلف ممالک و بلاد کی سیر نہ کی ہو، متقدمین میں بھی بعض ہندوستان میں آئے، اور متاخرین کے لئے تو گویا ہندوستان قسمت آزمائی کا مرکز قرار پا گیا تھا، خاقانی نے اپنے مختلف اشعار میں ہندوستان اور "ویران ہندی" کا تذکرہ کیا ہے لیکن وہ یہاں آیا نہیں پھر بھی اس نے عرب و عجم کے مختلف شہروں اصفہان و خراسان، تبریز و موصل، بغداد و حرمین کی سیر کی چنانچہ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل لکھتے ہیں:-

کرر بہ زیارت کعبہ شریف و اماکن مشرفہ سعادت حاصل کرد[2]

اس کے علاوہ خود اس کے قصاید اس کے ذوق سیاحی کے آئینہ دار ہیں خراسان، اصفہان اور تبریز کی مدح میں اس نے قصیدے لکھے بغداد کے سفر کا بھی حال درج کیا ہے اس سلسلہ میں اس کے مفصلہ ذیل ابیات قابل غور ہیں:-

اصفہان:- مدتا سی سال ہست کز سر اخلاص زندہ چنیں داشتم وفائے صفاہان
موصل:- در سنہ ثانون الف بہ حضرت موصل راندم ثانون الف ثنائے صفاہان
گرچہ صفاہان جزائے من بہ بدی کرد ہم نیکوئی کنم جزائے صفاہان

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ مظفری [2] صحف ابراہیم۔

خراسان:-	ہفت مرداں کہ منم ہشتم ایشاں بہ وفا	کہف شاں خانہ اخواں بہ خراساں یابم
	گم شد آں گنج جوانی کہ بسے کم کم داشت	از پئے گم شدہ تاواں بہ خراساں یابم
	یافت زر ہفت خزانم علم کافوری	من ہماں سندس میناں بہ خراساں یابم
تبریز:-	گرچہ فرماں ندہندم بہ خراساں رفتن	باز تبریز بہ فرماں شدنم نگذارند
	از پئے ایں بروجا مکتب و دوکاں دارم	نہ بہ مکتب نہ بہ دوکاں شدنم نگذارند
بسطام:-	روضۂ پاک رضا دیدن اگر طغیان است	شاید ار بر رہ طغیاں شدنم نگذارند
	در بہ بسطام شدن نیز زبے سامانیست	پس بداں بے سرو ساماں شدنم نگذارند
طوس:-	گر دہد رخصہ کنم نیت طوس	خوش و شاداں شوم انشاء اللہ
رے:-	در خراس ری از ایوان خراساں بریم	گرچہ آں طایفہ پرساں شدنم
بغداد:-	من بہ بغداد در ہمہ آفاق خاقانی طلب	نام خاقانی طراز فخر خاقاناں آمدہ

ان شہروں کے علاوہ وہ شروان سے بھاگ کر بیلقان بھی گیا تھا لیکن بہ روایت صحف ابراہیم خاقان کے عملداروں نے اس کو گرفتار کر کے دربار شاہی میں بھیجدیا بادشاہ نے سات ماہ تک قید کر کے اس کو رہا کردیا۔ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل فرماتے ہیں:-

ملا جامی در نفحات ایراد نمودہ کہ در سفر او در فتوحات عظیم روداد و با خضر ملاقات کردہ[1]

اس میں شک نہیں کہ خاقانی کے سلسلہ میں جامی کی بعض روایتیں ناقابل قبول ہیں مثلاً فلکی کو خاقانی کا استاد بتانا اور ۵۹۵ھ میں خلیفہ المستضیٔ کی وفات وغیرہ لیکن انھوں نے اس کو صوفی مشرب لکھا ہے اور اس کے چند اشعار نقل کر کے صرف اسی قدر فرماتے ہیں:-

از نہا بوئے آں می آید کہ وے را از مشرب صافی صوفیاں قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم شربی تمام بودہ است۔

نہ کہیں خضر کی ملاقات کا تذکرہ ہے اور نہ سفر میں "فتوحات عظیم" حاصل ہونے کا بیان ہمارے سوانح نگاروں کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک واقعہ سنکر یا کسی نامعتبر کتاب میں دیکھ کر محض حافظہ پر اعتماد کر کے اہل علم کی طرف اسکو منسوب کر دیتے ہیں حالانکہ یہ ضروری ہے کہ جس واقعہ کے انتساب میں کوئی شبہ ہو اس کی تحقیق کرنے کے لئے اصل کتاب پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

---

[1] صحف ابراہیم۔

مذہب فلسفی، صوفی اور شاعر کا مذہب عوام کے مذہبی دایرہ سے بہت زیادہ وسیع ہوتا ہے اس کے مذہب کا اصول عشق و جمال ہے اور اس کے وجدانات ہماری دنیائے آب و گل کی فریب خیالیوں سے بہت ارفع ہوتے ہیں خاقانی کے حکیم اور شاعر ہونے میں تو کلام ہی نہیں لیکن فلسفی اور صوفی ہونیکے باب میں بحث ضروری ہے ایک جگہ خود کہتے ہیں :-

بدل من آدمم اندر جہاں سنائی را   بدیں دلیل پدر نام من بدیل نہاد

اگلے سطور میں لکھا جاچکا ہے کہ امیر معزی اور سنائی کے مقابلہ میں خاقانی نے خود کو برتر بتایا لیکن یہ آغاز زندگی کی باتیں ہیں خود سنائی بھی اپنی اگلی زندگی میں ایسے بلند مشرب صوفی نہ تھے جیسا ان کو سمجھا جاتا ہے اس پر حدیقہ کے وہ اجزا شاہد ہیں جو سلاطین و شاہزادگان امرا و ارباب مناصب کی مدح سے متعلق ہیں اسی طرح خاقانی نے بھی خاقان شروان، و سلاجقہ اصفہان، عباسیہ، اتابکان موصل وغیرہ کی مدح گستری کی لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ نفسیات میں تغیر ہوتا گیا اور وہ ایک صوفی صافی بن گئے، درباری زندگی ترک کی، سلطان نے قید و بند ڈال کر دربار سے وابستہ رکھنا چاہا لیکن ایک مرتبہ بادہ للہیت کا جرعہ پینے کے بعد کسی چیز میں لذت تو ملتی نہیں اس عہد میں انھوں نے جو قصاید لکھے ہیں ان کو الہامات صوفیانہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے وہی پند و موعظت وہی فقر و فاقہ وہی زاویہ نشینی و زہد گزینی جو ہماری صوفیانہ شاعری میں پائی جاتی ہے، خاقانی کے یہاں بھی ہے اور اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ رومی و عطار کی طرح انھوں نے بھی حدیقہ سے استفادہ کیا قرین قیاس ہے کہ ۵۲۵ھ میں خاقانی کی ولادت ہوئی جیسا کہ اگلے سطور میں لکھا جاچکا، اور یہی حدیقہ کی تصنیف کا سال ہے اور بعضوں نے سنائی کی وفات کی تاریخ بھی اسی کو قرار دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں .... بہرحال خاقانی نے سنائی کا زمانہ پایا، ممکن ہے طفولیت یا آغاز شباب کا عالم ہو اس لئے ملاقات نہ ہوئی ہو۔

خاقانی کی آخری زندگی یقیناً ایک صوفی صافی کی طرح بسر ہوئی، اسی لئے ان کے تشیع یا تسنن پر زور دینا بے محل سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن کیا کیجئے ہمارے یہاں کے تذکرہ نگار اس قدر بلند حوصلہ اور رفیع الخیال ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ کسی کو کھینچ تان کر فرقہ بندی میں مبتلا کر دیتے ہیں چنانچہ تقی کاشی اور ملا نور اللہ شوستری نے اس کو شیعی مذہب لکھا ہے ملا نور اللہ فرماتے ہیں :-

در مواعظ و حکم طریقہ شیخ سنائی پیمودہ نقش مذہب اہل بیت بر لوح اعتقاد فی نگاشتہ

اما چوں در روزگار حکیم خاقانی حکم اسم الباطن در جمیع مواطن جاری بود، بہ تقیہ در طائفہ علیہ شیعہ مرتضویہ ساری لاجرم بعض از عقاید خود را در قصیدہ مشہور کہ مذکور خواہد شد بطریق کنایت دانمود

وطریق تعمیہ والغاز دراں بیہودہ دتا غایت صورت مضمون آں از انظار ابنائے زمان
مجوب دستور بودہ[1]

اس کے بعد شوستری نے خاقانی کا ایک قطعہ نقل کیا ہے اور اس کی لغو ومہمل تاویل کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ خاقانی کا خیال ہے کہ گنبد خضرائے مدینہ میں حضرت رسول اکرم صلعم کے پہلو میں صاحبین (حضرت صدیق وفاروق) کی قبریں نہیں ہیں اسی کے ساتھ اس کے چند اشعار سے محبت اہل بیت اور علوی دوستی پر استدلال کیا ہے حالانکہ ملا صاحب کو سمجھنا چاہئے تھا کہ اہل سنت بھی محبت اہل بیت پر زور دیتے ہیں اور ان کے شاعروں اور مصنفوں نے اس موضوع پر کافی اظہار خیال کیا ہے ایک جگہ خاقانی کہتے ہیں:۔

برسر روضۂ معصوم رضا شبہہ رضواں شوم انشاء اللہ

مگر اسی کے ساتھ اپنے چچا کے مرثیہ میں ضمناً یہ بھی فرماتے ہیں

زدیو گر بزندہ و او داعی انصاف زد حکمت نازندہ واو منہی الباسب
اں عقل و بد و گفت کہ اے عمر و عثماں ہم عمر خیامی ہم عمر خطا رب

دربار شاہی اگلے سطور میں تاریخ مظفری کے حوالہ سے لکھا جا چکا کہ ابوالعلا گنجوی خاقانی کا استاد اور خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ کے دربار میں ملک الشعراء کے عہدہ پر مامور تھا، اسی نے اپنے ہونہار شاگرد کو بھی دربار تک پہونچایا رفتہ رفتہ اس کو اتنا بلند مرتبہ حاصل ہوا کہ بقول صاحب "صحف ابراہیم" بادشاہ کے سامنے سونے کی کرسی پر بیٹھا کرتا تھا خاقان کے دربار میں اس کو اتنی بے تکلفی حاصل تھی کہ وہ آزادانہ اظہار جذبات کرتا تھا اس ضمن میں تمام تذکرہ نگاروں نے اس کا ایک شعر نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے:۔

وشقے وہ کہ در برم گیرد یا وثاقے کہ در برش گیرم

اس شعر میں انھوں نے خاقان سے ایک کنیز یا امرد غلام طلب کیا ہے اس پر آزاد بلگرامی کا اعتراض اور ابوطالب اصفہانی کا جواب بہت پر لطف ہے عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل لکھتے ہیں:۔

خاقان بر آشفت وگفت چرا ہر دو نخواست مگر قصورے در ہمت من دیدہ خاقانی رنجش خاقان فہمیدہ کسے را پر و بال کندہ بحضور خاقان فرستادہ و معروض داشت کہ تقصیر ایں کس است کہ بہ افگندن نقطہ داری از فضلہ خود یا وثاقے کرد[2]۔

اس پر غلام علی آزاد بلگرامی (مولف ید بیضا) کا اعتراض یہ ہے کہ خاقان کو تو اس پر خفا ہونا چاہئے تھا کہ شاعر نے

---

[1] "مجالس المومنین"، مولفہ سید نوراللہ بن سید شریف الحسینی المرعشی الشوستری۔ [2] صحف ابراہیم۔

بے ادبی کی، اور بے محابا غلام امر طلب کر بیٹھا ابو طالب بن محمد اصفہانی نے اس کا مفصل جواب دیا ہے اور آزاد کو گنوار بتاتے ہوئے سلاطین مغلیہ کے ناروا طریق معاشرت پر چٹکیاں لی ہیں فرماتے ہیں:۔

ایں شبہ بسبب کم تتبعی از اوضاع مردم ولایت دی را روی دادہ چہ در زمان قدیم کنیز وغلام خود جزو مرحمت وخلعت دستور بودہ و الآن ہم اعزہ تمام ولایت باسلاطین وامرائے خود بشرط اتحاد بے تکلفانہ زندگی می کنند واز عاداتے کہ متاخرین تیموریہ در ہند رواج دادہ اند کہ سائر خلق سلوک عبدیت با اکابر نمایند بغایت دور اند وحق اینست کہ بسیار قبیح است کہ در مواضع خاص اکابر از متوسلان خویش ادب عامیانہ توقع کنند[1]

اس کے بعد ابوطالب اصفہانی نے ہجو اور شوخ نگاری کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ ہجو شاعر کا حربہ ہے اور بڑے بڑے شعرا نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ کسی شاعر میں ہجو گوئی اور ہزل نگاری کا سلیقہ نہو تو گویا اسکی شاعری ہی ناقص ہے اس کے بعد انھوں نے اساتذہ فارس سعدی، عرفی، وحید وغیرہ کے کلام سے ہزل وشوخ نگاری کی چند مثالیں دی ہیں۔

مولانا آزاد اور ابوطالب اصفہانی دونوں اپنی اپنی جگہ پر ایک حد تک صحیح ہیں اس وجہ سے کہ ہندوستان کے رسوم وقیود کی دنیا میں یقیناً اس نوع کا بے محابا طریق طلب آقا کے سامنے سخت بے ادبی ہے ہر قوم اور ہر سرزمین کی اخلاقیات کو ایک ہی زاویہ نظر سے دیکھا نہیں جا سکتا ڈاکٹر رسل ویلیس نے اپنی کتاب "معاشرانہ فضا اور اخلاقی ترقی" میں اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے مولانا آزاد بلگرامی نے اس واقعہ کو ہندوستانی معاشرت کے مطابق نہیں پایا اور اس لئے اس پر تعجب کیا ابوطالب اصفہانی کے جواب کا یہ حصہ بہت ہی معقول ہے کہ لونڈی غلام عطائے شاہی کا جزو سمجھے جاتے ہیں اس لئے خاقانی نے بادشاہ سے یہ بھی طلب کیا اگر معاملہ یہیں تک ہوتا تو مضایقہ نہ تھا لیکن " در برم گیرد " اور " در برش گیرم " ہندوستانی نقطۂ نظر سے یقیناً محل نظر ہے، ممکن ہے خاقانی کے عہد میں ولایت میں سلاطین نے اپنے متوسلین کو اجازت دے رکھی ہو کہ وہ ان کے سامنے بے تکلفانہ جس طرح جی میں آئے اظہار خیال کریں لیکن دور متاخرین میں ابوطالب اصفہانی سے پہلے ہی خود شاہزادہ سلیمان صفوی نے صائب تبریزی سے محض ایک معمولی شوخی پر نہ تو کبھی شعر سنا اور نہ مدت العمر کلام کیا۔

شاہزادہ سلیمان صفوی کی شادی تھی، شاہزادہ کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں وہ بہت ہی حسین وجمیل تھا خوش روئی وخوش پوشی ایک شاعر کو جس طرح بیتاب کردیتی ہے دنیا سے پوشیدہ نہیں صائب نے ایک قصیدہ پیش کیا اس کا ایک بیت یہ تھا:۔

احاطہ کرد خط آں آفتاب تاباں را گرفت خیل پری در میاں سلیماں را

شاہزادہ کو سخت رنج ہوا اور پھر ساری عمر صائب سے بات تک نہ کی۔[1]

اس لئے ابو طالب اصفہانی کا آخری مغل بادشاہوں پر اعتراض کرنا صحیح نہیں اگر ہندوستان میں امرا و سلاطین اپنے ماتحت سے "ادب عامیانہ" ملحوظ رکھتے ہیں تو ایران میں یہ "کبریائی" ناپید تھی کچھ تھوڑی ہی آئین ہمارے ہندوستانی بھائی جو عرب و ترکستان، ایران و توران کا خواب دیکھا کرتے ہیں اور ہمیشہ اپنا رشتہ ارتباط انھیں غیر ممالک سے وابستہ رکھنے کے لئے وطنی ہمدردیوں سے یکسر دور ہیں، دیکھیں ایرانی شعرا، و تذکرہ نگاروں (شیعہ سنی کی قید نہیں) نے محض ملکی عصبیت کی بنا پر ہندوستانیوں پر اکثر پھبتیاں کی ہیں، ایرانی شعرا یہیں کے نان ربا بھی تھے اور اسی ملک کی آب و ہوا اور یہاں کے اوضاع و مراسم کی ہجو بھی کرتے تھے، غرض کے بندے تھے، ادبی تجارت کی اور گھر کا رستہ لیا شیخ آذری اسفرائنی، صائب تبریزی، علیم رکنائے کاشی سبھی اس مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں حزیں نے ہند اور اہل ہند کی سخت سے سخت ہجویں کی، والہ داغستانی پر ملکی عصبیت طاری تھی غالب ہندی نژاد تھا وہ بھی ایرانیوں کی اُستادی تسلیم کرتا ہے اور بیدل و ناصر علی کو نظر میں نہیں لاتا اور قتیل و واقف کو محض بے مایہ سمجھتا ہے کاش اہل ہند کی آنکھیں ہوں اور وہ دیکھیں کاش ان کے قلوب ہوں اور ان میں گرمی پیدا ہو کب تک وہ خیالی فریب کاریوں میں گرفتار رہیں گے اور ہندوستانیوں سے رشتہ جوڑنے کی بجائے غیر ملکیوں سے ساز باز رکھیں گے، اسلام یقیناً وطنیت کا نام نہیں اور وہ سارے عالم کے انسانوں کو ایک رشتہ محبت و اخوت میں جوڑنا چاہتا ہے مگر اس کا کیا جواب کہ ہم ہر معاملہ کو مذہبی رنگ میں رنگ دیتے ہیں اور دوسرے ملک والے اپنی ملکی و وطنی خصوصیتوں پر بھی نازاں ہیں کاش ہمیں بھی احساس ہو کہ "ہندوستانی" ہونا ہمارے لئے بھی مایۂ نازش ہے!

خاقانی کو منوچہر شروان شاہ کے دربار کے علاوہ سلجوقیہ اور اتابکان موصل سے بھی علاقہ رہا غیاث الدین محمد مسعود بن ملک شاہ کی مدح میں کہتے ہیں۔

اول سلجوقیان سنجر ثانی کہ ہست سایہ اش خیر العباد سایہ رب انم

قصیدہ بہت طویل ہے اس میں بانوے ابیات ہیں۔

دولت شاہ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ خاقانی حج کو جا رہے تھے، مکہ کے رستہ میں جمال الدین موصلی سے ملاقات ہو گئی، ان کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا اسی طرح اتابک عراق مظفر الدین قزل ارسلان کی مدح میں بھی ایک قصیدہ ہے۔

---

[1] ریاض الشعرا والہ داغستانی۔

گرچہ ملک الغرب توئی تا ابد اما　　برتخت خراساں ملک الشرق تو شائی

خاقانی نے خود اپنے قصیدہ میں قیام موصل کا حال لکھا ہے جیسا کہ اگلے سطور میں سیر و سیاحت کے ضمن میں لکھا جا چکا ہے۔

خصوصیات کلام خاقانی کی دقت پسندیاں اور دقیقہ سنجیاں تو مسلم ہیں اور اسی لئے اس کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا چنانچہ بقول عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل فیضی خاقانی کا کلام پسند نہیں کرتا تھا حالانکہ خود فیضی نے سواطع الالہام (تفسیر بے نقط) لکھ کر اپنی مشکل پسندی کا بہت کچھ ثبوت پیش کیا ہے اسی طرح بعض نقادان ادب "لغات و اصطلاحات غیر متعارفہ" کی بنا پر اس کا کلام ناپسند کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ جس بادشاہ یا امیر کے دربار میں وہ اپنا قصیدہ بھیجتا تھا تو ایک ہزار اشرفیوں سے اسکو کم صلہ نہیں ملتا تھا۔

خاقانی حج کرنے گیا حرم شریف مشرق و مغرب کے علما و نقادان فن سے بھرا ہوا تھا شاعر نے ایک قصیدہ کہا جس کا ایک بیت یہ ہے ؎ صبح از حمایل فلک آہیخت خنجر ش

اس کا نام "باکورۃ الاشعار و مذکورۃ الاشجار" ہے۔

ابوطالب اصفہانی کی روایت ہے کہ "شرفائے مکہ بہ آب زر نوشتہ با محضر بے نظیرش بہ در خانہ کعبہ آویختند"۔ اس سے بڑھ کر اور کیا کسی شاعر کی پذیرائی ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اس نے لیا لو شیر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کا پہلا بیت یہ ہے ؎

رخسار صبح پردہ بہ عمد ابر افگند　　راز دل زمانہ بہ صحرا بر افگند

ممدوح نے اس کو صلہ میں دو ہزار اشرفیاں دیں۔

(باقی)

عبد المالک آروی

"فلسفۂ مذہب" صرف آٹھ آنہ میں

اردو میں پہلی کتاب ہے جو اسلامی شعائر و عقائد پر ناقدانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اسکا مطالعہ کرے۔ چونکہ اسکی جلدیں کم رہ گئی ہیں اس لئے اسٹاک ختم کرنیکے لئے بجائے ایک روپیہ کے آٹھ آنہ میں مل سکتی ہے۔ محصول اسکے علاوہ ہوگا
(منیجر نگار)

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

۱۸۵۷ء

تیسرا ایکٹ — پہلا منظر

(۵ جون ۱۸۵۷ء کی صبح۔ جھانسی میں قصر شاہی کا دربار عام۔ منظر وہی جو پہلے ایکٹ کے تیسرے منظر میں تھا۔ صرف تخت شاہی موجود نہیں ہے۔ رانی کی مسند کمرہ کے وسط میں ہے۔ داہنی طرف ایک ایرانی قالین پر انند راؤ پنڈت جی کے سامنے بیٹھا ہوا سر ہلا ہلا کر پڑھ رہا ہے پنڈت جی ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہے ہیں اور کبھی کبھی انند راؤ کو ٹوکتے جاتے ہیں۔ رانی ادھر اُدھر گھوم رہی ہے گویا کسی گہری فکر میں مبتلا ہے۔ تھوڑی دیر بعد گنگا بائی دوڑی ہوئی کمرہ میں آتی ہے۔ لیکن انند راؤ اور پنڈت کو دیکھکر جھجکتی ہے۔ بعد ازاں جھپٹ کر رانی کے پاس پہونچکر گھبرائی ہوئی آواز میں رانی سے کہتی ہے)

گنگا بائی:- بہن! بہن!! غدر ہوگیا۔ ایک حولدار نے جس کے ساتھ پچاس سپاہی ہیں میگزین پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ کمپنی کی باقی فوج بھی بہت جلد ان کے ساتھ ہو جائے گی۔

رانی:- (ٹہلتی ہوئی دبی آواز میں) بیوقوف! گدھے!! بالآخر اس پاگل بخشش علی کے کہنے میں وہ بھی آگیا۔ اب وہ جیلخانہ کے دروازے بھی کھول دیگا اور پھر ایشور ہی جانتا ہے کیا ہوگا۔

گنگا بائی:- ابھی وقت ہے۔ چلو یہاں سے بھاگ چلیں جب سپاہی ہاتھوں سے نکل جائیں گے تو معلوم نہیں کیا حشر ہو۔ ابھی سے لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں کہ یہ کریں گے وہ کریں گے۔

رانی :- (سخت لہجہ میں) گنگا بائی، بڑی شرم کی بات ہے!! جو عورت حکمراں مرہٹہ خاندان سے تعلق رکھنے کا دعویٰ رکھتی ہو اس کی زبان سے ایسی باتیں مناسب نہیں۔ تم اگر چاہو تو جاسکتی ہو لیکن میں نہیں جاؤں گی۔

گنگا بائی :- (رانی کے پاؤں پر گر کر) بہن معاف کرو۔ اگر پھر ایسے شرمناک الفاظ زبان سے نکالوں تو زبان کاٹ ڈالنا۔ لیکن میں نے بزدلی کی وجہ سے ایسا نہیں کہا۔ میں صرف یہ خیال کرتی تھی کہ اس مصیبت کے وقت کونسا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ اگر کمپنی کی فوج غدر کرے تو ہم کو اس سے کوئی مطلب نہ رکھنا چاہئے اور ہمارے سلئے یہی زیادہ مناسب ہوگا کہ اُسوقت واپس ہوں جب دونوں میں سے کوئی فتح حاصل کرلے۔

رانی :- (آہستہ سے پنچ پر ٹیک لگاکر) گنگا بائی! تم نے اپنی ان ہوشمندانہ باتوں سے تو مجھے تھکا دیا ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں جو جھانسی سے اتنی محبت کرتی ہوں عین ایسے موقع پر اُسے خیرباد کہدوں جبکہ اُسے میری ضرورت ہے۔ کیا کوئی آگ لگنے کے وقت اُس گھر کو چھوڑ دیتا ہے جس میں صدہا برس اُس نے اور اُس کے اہل و عیال نے زندگی بسر کی ہو۔ نہیں۔ بلکہ اُس وقت وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ اپنے گھر کو کسی نہ کسی طرح بچائے۔

گنگا بائی :- (پنچ کے پاس جاکر) لیکن بہن! اگر کمپنی نے غداروں پر فتح پائی تو انگریز حکام جھانسی کے مقتدر لوگوں کو بدنام کرینگے کہ انھوں نے غداروں کو پس پردہ کمک دی۔ اور اگر غدار فتحیاب ہوئے تو وہ اپنی حکومت قایم کریں گے اور کسی مسلمان سپاہی کو اپنا سردار بنالیں گے۔ اس لئے اگر تم یہاں ٹھہری رہیں تو تمھارے دو نقصان ہیں۔ تمھارا گزارا بھی جائے گا اور رانی بننے کا جائز حق بھی۔

رانی :- (بیٹھکر) ٹھہرو! ٹھہرو! گنگا بائی! ان پریشان کن خیالات کو مجھ سے الگ رکھو۔ تم بھاگ چلنے کو کہتی ہو، باپ اور دیوان غداروں کا ساتھ دینے کو کہتے ہیں اور مہاراج سندھیا انگریزوں سے وفاداری کرنے کا پیغام بھیجتے ہیں۔ میرے سر کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔ (انند راؤ کو دیکھکر) اگر انند کا خیال نہ ہوتا تو میں زندگی ختم کردیتی اور ان جھگڑوں سے نجات پاجاتی۔ تین ہفتے ہوئے جبسے میرٹھ میں غدر کی خبر سنی مجھے نیند نہیں آئی۔ جھانسی ہی میں غدر شروع ہوگیا اور اب تو عرصہ تک چین ملنا ممکن نہیں (ذرا ٹھہر کر اور یکایک پھر گنگا بائی سے مخاطب ہوکر) بہن ذرا جاؤ، میرے باپ کو تو ڈھونڈو یقیناً انھیں تازہ خبریں معلوم ہوں گی۔ دوڑو! میں سمجھتی ہوں کہ مجھے جلد کوئی تدبیر اختیار کرنا چاہئے۔ گو کہ اب میں نام ہی نام کو رانی باقی رہگئی ہوں تاہم مجھے یقین ہے کہ اب بھی میری تھوڑی بہت عزت باقی ہے۔

(جونہی گنگا بائی دروازے کی طرف جاتی ہے۔ ماما صاحب اور اُن کے پیچھے تارا سنگھ دیوان داخل ہوتے ہیں۔ گنگا بائی الگ کھڑی ہوکر اُن کو غور سے دیکھتی ہے۔ اور باہر چلی جاتی ہے انند راؤ دونوں آدمیوں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اُن کی طرف دیکھتا ہے لیکن پنڈت جی

اپنی کتاب پڑھنے جاتے ہیں)

ماما صاحب:۔ (خوشی کا چہرہ بنا کر) خوشخبری! بیٹی! جھانسی میں مرہٹوں کا راج ایک مرتبہ پھر ہوگا۔ کمپنی کے سواروں نے طے کر لیا ہے کہ باغیوں سے مل جائیں گے۔

تارا سنگھ:۔ رانی! حولدار گور بخش نے میگزین پر قبضہ کر ہی لیا ہے اور بخشش علی داروغہ جیل حکم پاتے ہی قیدیوں کو رہا کر دے گا۔

رانی:۔ (سختی سے) دیوان صاحب! آپ پر مجھے تعجب معلوم ہوتا ہے اور پتاجی، آپ پر بھی۔ میرا خیال تھا کہ آپ دونوں کبھی اسے نہ پسند کریں گے کہ کوئی سپاہی عہد وفاداری توڑے خواہ وہ کسی کا ماتحت ہو۔

تارا سنگھ:۔ رانی! یوں تو میں بھی اسے نہ پسند کرتا کہ کوئی سپاہی اپنے مالک کے خلاف بغاوت کرے۔ لیکن یہ سپاہی عہد شکنی کی معقول وجہ رکھتے ہیں۔ اُن کی شورش کی وجہ مذہب ہے اور انگریزوں نے اُن کے مذہبی اُصول میں مداخلت کی ہے۔

رانی:۔ (طعن کے لہجہ کو چھپا کر) اور کیا تم اُن کا ساتھ مذہب کی وجہ سے دیتے ہو؟

ماما صاحب:۔ (بے صبری سے) ہاں! بیٹی! مذہب کی وجہ سے۔ سیاسی اور مذہبی وجوہ دونوں ایک ہی طرح پاک ہیں۔

تارا سنگھ:۔ اور یہی میرا بھی جواب ہے۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ انگریزوں نے اُن کے پاک عقیدہ کو گندہ کر دیا ہے اور ہم ہندوؤں کا خیال ہے کہ انگریزوں نے ہمارے پاک رسم و رواج تبنیت اور وراثت کو چھین لیا ہے۔ یہ بھی خدا کی مہربانی ہے کہ انتقام کا موقع اُس نے ایسا دیا جس میں دونوں قومیں مشترک ہیں۔

رانی:۔ (طعن آمیز لہجہ میں) دیوان صاحب! تین ماہ قبل تو آپ انگریزوں کے اس قدر خلاف نہ تھے اب کس بات نے آپ کو ان کا مخالف کر دیا ہے۔

ماما صاحب:۔ بیٹی! بہت سخت مت ہو۔ علاوہ تمھارے ہم سب اُسوقت مغالطہ میں تھے۔ انگریزوں نے ہم کو بیوقوف بنایا اور وہ ہمیشہ ہندوستانیوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔

تارا سنگھ:۔ مجھے اپنی بیوقوفی پر سخت افسوس ہے۔ میں نے جو کچھ کیا آپ کے فائدے کے لئے کیا میری یہ تجویز کہ گدی کے تمام حقوق کے معاوضہ میں معقول پنشن دیدی جائے آپ ہی کے فائدے کے لئے تھی۔ لیکن جب مجھ کو یہ علم ہوا کہ گزارہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مرگباش راجہ کا قرضہ ادا کیا جائے تو جی چاہتا تھا اپنا سر پھوڑ ڈالوں کہ میں نے میجر ایلیس کی چکنی چپڑی باتوں پر کیوں اعتماد کیا

رانی:۔ (غصہ سے) اپنا افسوس چھوڑئے۔ دیوان صاحب! میں ان احسانات کی زیادہ پروا نہیں

کرتی ہوں جو انگریزوں نے زبردستی مجھ پر کئے ہیں۔ یہ مثل قرضہ جات حسنہ کے ہیں اور میں جھانسی کے کسی قرضدار کو قرض نہ ادا کرنے کے بجائے فاقہ کشی سے مرنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔ (سخت ہو کر) میجر ایلس کو چھوڑ دو۔ اُنھوں نے تو جھانسی کو بچانے کی تنہا اتنی کوشش کی ہے کہ آپ سب مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ماما صاحب:۔ (مداخلت کرتے ہوئے) بیٹی ہم وقت برباد کر رہے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی ضرورت پڑے گی کہ از سر نو جھانسی راج کا اعلان کیا جائے۔ انند کمار مستقبل راجہ ہوں گے اور تم نائب ہو گی اس لئے سب انتظام تیار رکھو اور اشارہ کی منتظر رہو۔ ہم غداروں سے سازش کر چکے ہیں۔ اور اُنھوں نے نئے راج کی اعانت کا اقرار کر لیا ہے۔

رانی:۔ (کھنچکر اور مستحکم ارادہ کے ساتھ)۔ ماما صاحب مجھے نہ آپ کے احکام کی ضرورت ہے نہ غدار سپاہیوں کے احکام کی۔ انگریز ابھی تک برسر حکومت ہیں۔ میں اس نزاع میں نہ اُن کا ساتھ دینا چاہتی ہوں نہ اُن کے نوکروں کا۔

ماما صاحب:۔ (غصہ سے) تم طوطے کی طرح وہی رٹ رہی ہو جو سندھیا اور اُس کے مکار دیوان ڈنکر راؤ نے تم کو پڑھا دیا ہے۔ میں تمھیں مطلع کرتا ہوں کہ یہاں کے حالات گوالیار اور اندور کے حالات سے مختلف ہیں ہمارے پاس ذاتی فوج مثل سندھیا اور ہلکر کے نہیں جس پر بھروسہ کریں۔ پس فتحیاب فریق سے ہم کو صلح کرنا چاہئے۔ میرٹھ کے سپاہیوں کے غدر کو تین ہفتہ سے زیادہ ہو گئے اور شورش ہر چہار جانب پھیل رہی ہے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک انگریز بھی ہندوستان میں نظر نہ آئے گا۔ اس لئے اگر اس جھگڑے میں اپنا پہلو مضبوط رکھنا ہے تو ہم کو ابھی سے اس کا انتظام کرنا چاہئے۔

رانی:۔ (بنچ پر بیٹھ کر) مجھے عجلت نہیں اچھی معلوم ہوتی۔ ابھی سے کوئی تصفیہ نہیں کیا جا سکتا کیا ہو گا۔ ڈنکر راؤ جو کہتا ہے خود سمجھتا ہے۔ انگریز ہمیشہ لڑائی بُری طرح شروع کرتے ہیں۔ لیکن سمندر پار اُن کے پاس بڑے سامان ہیں جن کو ضرورت پر وہ جہازوں میں لے آئیں گے۔ میں محل کے دروازے بند کرا دوں گی اور پہرہ بٹھا دوں گی۔ اور جب تک یہ طوفان دور نہ ہو جائے ہم سب بند رہیں گے۔ (انند راؤ سے جو کھڑا ہو کر ماما صاحب کو گھورنے لگتا ہے۔) انند! تم پڑھو۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔

ماما صاحب:۔ (رانی کی طرف غصہ میں گھوم کر) پڑھو! پڑھو! تم تو نہایت ہی سخت احمق نکلیں۔ تم تو بڑی سچی مرہٹہ عورت بنتی تھیں۔ اب کیا ہوا کہ اُس چور ڈلہوزی کی باتوں پر عمل کر رہی ہو۔ (انند کی طرف دیکھ کر جو ہٹ کر الگ ہو جاتا ہے) پڑھو، ہاں پڑھے جاؤ، جبکہ تمھیں اپنے حقوق کے لئے جنگ کی تیاری کرنا چاہئے۔ (لکڑی کی چھوٹی میز میں لات مارتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔ انندراؤ رانی کے پاس جاتا ہے جو سیدھی

ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور پنڈت متعجب ہو کر جھک جاتا ہے) پڑھے جاؤ! یہاں تک کہ جھانسی راج مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جائے اور کوئی مسلمان سردار جھانسی پر حکومت کرنے والا آجائے۔

(ماما صاحب چیزوں کو ٹھکراتا ہوا کمرے سے باہر جاتا ہے اور طعن سے چلاتا جاتا ہے پڑھو! پڑھو! رانی بیں پردہ ہوتی ہوئی ایک بازو انند راؤ پر رکھتی ہے جو اپنا سر اُس کی گود میں چھپا لیتا ہے اور نیم وا آنکھوں سے ماما صاحب کو دیکھتا جاتا ہے۔ دیوان جو پیچھے کھڑا تھا ماما صاحب کے پیچھے رانی کو سلام کرتا ہوا باہر چلا جاتا ہے)

پردہ گرتا ہے

دوسرا منظر

(۷ رجون ۱۸۵۷ء۔ خس کی ٹٹی گزرگاہ پر بالاخانہ کے دروازہ پر لپیٹ دی گئی ہے۔ رانی پلنگ پر لیٹی پنکھا جھل رہی ہے۔ انند راؤ فرش پر پلنگ کے نزدیک بیٹھا اُس کی طرف مغموم دیکھ رہا ہے۔ گنگا بائی پیچھے بیٹھی کچھ سی رہی ہے اور وقتاً فوقتاً گزرگاہ کو دیکھتی جاتی ہے۔ نیچی لکڑی والی میز جس پر کتابیں اور لکھنے کا سامان رکھا ہے، داہنی جانب رکھی ہے)

انند راؤ:۔ پھر ہم سپاہیوں سے کیوں نہ مل جائیں اور انگریزوں کو مار ڈالیں۔ قلعہ میں تھوڑے سے ہیں۔

رانی:۔ بیٹا! میں تم سے بار بار کہہ چکی ہوں کہ باغیوں کے بنانے سے راجہ بننا خطرناک ہے۔ اگر گدی مکاری سے حاصل کی جائے گی تو مکاری اُسے چھنوا بھی دے گی۔

انند راؤ:۔ رانی اماں! لیکن آپ مجھے تلوار کی مشق کی ہدایت کرتی تھیں۔ اگر ہم اسوقت انگریزوں پر حملہ نہ کریں گے تو ہم کو جھانسی فتح کرنے کا موقع کبھی نہ ملیگا۔

رانی:۔ (بیٹھ کر ذرا دلیری سے) اگر پیشوا اپنے راج کو دوبارہ سنبھال لیتے اور مرہٹہ فوج باقاعدہ میدان میں آئی ہوتی تو میں انگریزوں پر حملہ کرنے میں ذرا نہ جھجکتی۔ میں اس کو مذہبی لڑائی سمجھتی اور جو کچھ میرے پاس ہے صرف کر دیتی حتیٰ کہ اپنی زندگی تک قربان کر دیتی۔ (مغموم ہو کر) لیکن بیٹا وہ موقع نہیں ہے۔ چند باغی سپاہی راج کی بنیاد نہیں ڈال سکتے جس سے ہم مرہٹوں کو اطمینان ہو جائے۔ اگر کمپنی کے مسلمان ملازمین کا ہم سہارا پکڑیں تو ہمارے پاس جو تھوڑا بہت ہے وہ بھی نہ رہیگا۔

انند راؤ:۔ لیکن ماما صاحب کہتے ہیں کہ سب انگریز مار ڈالے جائیں گے اور اگر اب ہم نے سپاہیوں کی مدد نہ کی تو سپاہی پھر ہم کو جھانسی نہ واپس دیں گے۔

رانی :۔ (غصہ سے کھڑی ہوکر) ماما صاحب اور سب لوگوں کی طرح ہیں۔ اُن کو اپنی فکر ہے کہ جو کچھ مل سکے حاصل کرلیں۔ اُنھیں دوسروں کی خواہش اور آرام کی فکر نہیں۔ اُنھوں نے پہلے مجھے راجہ گنگادھر کے ہاتھ بیچا اور پھر انگریزوں کے ہاتھ۔ اور اب وہ مجھے ان سپاہیوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں اب نہ فروخت ہوں گی۔ مہاراجہ سندھیا صحیح کہتے ہیں۔ بغاوت ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمیں کسی کی طرفداری نہ کرنا چاہئے اگر ماما حب۔ ۔۔

گنگا بائی :۔ (دوڑکر آتے ہوئے) بہن! میں نے ابھی راؤ آپا کو صحن سے آتے اور محل میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ اُن کے کپڑے بالکل پھٹے ہوئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ کسی جنگ میں مشغول تھے۔ پرمیشور کرے کوئی بُری خبر نہ لائے ہوں۔

رانی :۔ (خاموش بنچ پر بیٹھی ہوئی) مرہٹوں کی لڑکیوں کو ہمیشہ بُری خبر سُننے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ گنگا بائی! جاؤ اور راؤ آپا کو اندر لے آؤ۔ (انند راؤ سے جو ابھی تک فرش پر مبیٹھا تھا) بیٹا! آؤ! میرے پاس کھڑے ہوجاؤ۔ اب جو کچھ لکشمی بائی پر مصیبت آئے تم بھی اُسمیں حصہ لینا میں سمجھتی ہوں کہ خوشی کے دن ختم ہوگئے۔

(انند راؤ کھڑا ہوجاتا ہے اور رانی سے لپٹ کر ایک طرف ہوجاتا ہے۔ گنگا بائی جو دروازہ میں جھانک رہی تھی دروازہ کھولتی ہے۔ راؤ آپا پاگلوں کی طرح پھٹے کپڑے اور بکھرے بالوں کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اُس کے سر پر پگڑی بھی نہیں اور بہت مضطرب نظر آتا ہے۔ رانی کے پیروں پر گرکر چلاتا ہے اور پیشانی فرش زمین سے ٹکراتا ہے۔)

رانی :۔ (بنچ سے جھک کر اور راؤ آپا کا کندھا تھپتھپاکر) مرہٹہ جنگجو سپاہی کو اگر اُس کی رانی پر مصائب پھٹ پڑیں چلانے کی ضرورت نہیں۔ راؤ آپا! کیا ہوا؟ میں تیار ہوں۔

راؤ آپا :۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) رانی صاحبہ! میں آنے والے مصائب سے خائف نہیں ہوں بلکہ میری پریشانی کا باعث سپاہیوں کی نمکحرامی ہے جنھوں نے عرصہ تک جھانسی راج کا نمک کھایا ہے۔

رانی :۔ کیا محل کے محافظین کے متعلق تم کہہ رہے ہو۔ آج ہی سویرے اُنھوں نے مجھ سے عہد وفاداری کی قسم کھائی ہے اور اقرار کیا ہے کہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو وہ میرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔

راؤ آپا :۔ (پیشانی زمین پر مار کر) افسوس! رانی صاحبہ! اُن سب نے بدعہدی کی اور سب باغیوں سے جا ملے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اُن کو ڈرایا گیا کہ اگر تم رانی کا ساتھ دوگے تو کھانے میں تم کو زہر دیدیا جائے گا۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ باغی سپاہیوں نے اُن کو بڑے بڑے انعامات دینے کا وعدہ کیا۔

رانی :۔ (غصہ کو دباتے ہوئے کھڑی ہوکر) یہ دھمکیاں اور وعدے کس کے نام سے دئے گئے؟

راؤ آپا :- بخشش علی داروغہ جیل کے نام سے۔ رانی صاحبہ! اِس شخص نے تمام مخلوق کو اُسوقت سے جب سے کہ قیدی رہا ہوئے سخت خائف کر رکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بالکل دیوانہ ہوگیا ہے۔ اور اُس کا منھ تھوک سے بھر آتا ہے۔ جب کوئی انگریزوں سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا کام اُس کے سپرد کیا ہے۔

رانی :- اُس پاگل سے باغی سپاہیوں کے سردار کیا کہتے ہیں؟

راؤ آپا :- رانی صاحبہ! وہ اُس کو نہیں سمجھا سکتے! اُس کا اثر مخلوق پر بے انتہا ہے۔ اور فوج کے لوگ بھی فتنہ و فساد کے ڈر سے اُس کی مخالفت نہیں کرتے۔ اُسی نے لوگوں کو میرے پیچھے لگا دیا کہ مجھے مار ڈالیں کیونکہ میں محافظین کو واپسی کی ترغیب دے رہا تھا۔

رانی :- (مجبور سی ہوکر) میں سمجھتی ہوں کہ باغی اب اگر ہماری محاصرہ والی توپوں کو صحن سے علحدہ کر دینگے محافظین یقیناً اُن کو پتہ بتلادیں گے کہ کہاں چھپی ہیں۔ اگر ہماری توپیں قلعہ کی دیوار پر چلیں تو انگریز یقینی اطاعت قبول کرلیں گے یا جانیں لڑکر دیدیں گے۔

راؤ آپا :- (کھڑے ہوکر) رانی صاحبہ! جب میں آدمیوں کے ہجوم میں تھا ایک نہایت شرمناک واقعہ پیش آیا۔ تین انگریز مسلمانوں کی صورت میں پکڑے گئے جو آپ کے پاس محصورین کی امداد کے لئے آرہے تھے۔ جب اُن کا لباس علحدہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تینوں افسر تھے جو قلعہ کی حفاظت نہایت انہماک کے ساتھ کر رہے تھے۔ (منھ پر ہاتھ رکھکر اور منھ پھیر کر) میری آنکھوں کے سامنے بخشش علی کے ساتھیوں نے اُن کو ذبح کر دیا تاکہ اور لوگوں کو جو آپ سے ملنا چاہیں تنبیہ ہو جائے۔ (ذرا ٹھہر کر) اُسی غل و شور میں میں نکل بھاگا۔

(رانی بنچ سے کھڑی ہو جاتی ہے اور مٹھی دبا کر سینہ پیٹتی ہے اور اِدھر اُدھر قدم ڈالتی ہے اور سر ہلا کر غصہ میں کہتی ہے)

رانی :- بیشک اب بادل گھر آئے ہیں خون برسنا شروع ہوگیا ہے اور معلوم نہیں اب کب بند ہو۔

(پہلے بھنبھناہٹ کی آواز آتی ہے اور پھر یہی آواز بلند ہو جاتی ہے اور شور ہونے لگتا ہے۔ صحن میں ہجوم دکھائی دیتا ہے جو بخشش علی کی قیادت میں توپیں تلاش کرتا ہے۔ غل ہوتا ہے کہ توپیں چل گئیں۔ بخشش علی کی آواز گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ رانی کو برا بھلا کہتا ہے اور مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔ ہجوم بھی بخشش علی کی آواز کو دہراتا ہے جس سے وہ خوش ہوتا ہے محل میں سب متوحش ہو جاتے ہیں۔ انند راؤ روتا ہوا رانی کے پاس جاتا ہے۔ ہاتھ کانوں پر رکھے ہوئے اور سر جھکائے ہوئے۔ رانی کوشش کرکے بولتی ہے اور راؤ آپا کو بلاکر

انند راؤ کو علحٰدہ لے جانے کے لئے کہتی ہے۔ اسی اثنا میں گنگا بائی آہستہ سے بالاخانہ پر آجاتی ہے۔ خود چھپکر صحن پر نظر ڈالتی ہے۔ غل کچھ دیر کے لئے کم ہوجاتا ہے اور بخشش علی کی بلند آواز اور ڈانٹ پھٹکار سنائی دیتی ہے۔ راؤ آپا اور لڑکا جب آواز تیز ہوتی ہے ٹھہر جاتے ہیں مگر لڑکا کچھ نہ کچھ بولتا جاتا ہے۔

بخشش علی کی آواز:- کہاں ہے؟ وہ لامذہب بت پرست بے حیا عورت! کہاں ہے؟ ہمارے عتاب سے اِن کافروں کو کیسے بچائے گی۔ اُس کو باہر لے آؤ میں خود اُسے قتل کروں گا۔ انگریزوں کے سب دوست ہمارے دشمن ہیں۔ لے آؤ! ورنہ ہم اِس منحوس بھٹہ میں آگ لگا دیں گے۔ خدا نے یہ پاک کام میرے سپرد کیا ہے کہ میں ہندوستان کو ان تمام وباؤں اور خباثتوں سے پاک کردوں۔ جاؤ ابھی لاؤ ورنہ تم سب قتل کئے جاؤ گے
(باہر شور ہوتا ہے اور اُس کی آواز گم ہوجاتی ہے۔)

رانی:- (جس طرح کوئی کسی کام پر تیار ہو انند راؤ کی طرف اشارہ کرکے) راؤ آپا! اِس چوں چوں کرنے والے چوہے کو لے جاؤ اور کسی سوراخ میں چھپادو۔ نہ یہ سچا مرہٹہ معلوم ہوتا ہے نہ شاہی خاندان کا موزوں قایمقام ہوسکتا ہے۔

(راؤ آپا دروازے کی طرف جاتا ہے اور انند راؤ کو ہاتھ پکڑ کر لے جاتا ہے۔ یکایک لڑکا ہاتھ چھڑا لیتا ہے اور رانی کی طرف جھپٹتا ہے اور چھوٹے ہاتھوں سے اُسکو پکڑ لیتا ہے۔

انند راؤ:- مہربانی کرکے مجھے نہ بھیجئے۔ رانی ماں۔ میں اب نہ روؤنگا۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا مگر میں آنسو نکلنے سے مجبور ہوں۔ رانی ماں مجھے علحٰدہ نہ کیجئے۔ دیکھئے میں اب نہیں روتا ہوں۔ (ماں کی طرف دیکھکر) اور اگر چلاؤں بھی تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں ڈرتا ہوں۔ میں مرہٹہ سپاہی ہوں اور دشمن سے خوب مقابلہ کرسکتا ہوں۔

(رانی جھک جاتی ہے اور اُس کو گلے لگا کر پیار کرتی ہے اور راؤ آپا کو اشارہ کرتی ہے کہ وہ بالاخانہ سے دور ایک جانب کھڑا ہوجائے۔

گنگا بائی:- (زور سے بالاخانہ سے نیچے دیکھتی ہوئی) وہ توپیں لئے جارہے ہیں۔ محافظ اُن کو امداد دے رہے ہیں۔ اُن کو گولیاں بارود بھی مل گئی ہیں۔ لیجئے اب محافظ بتلا رہے ہیں کہ توپیں کیونکر بھری جاویں گی۔ توپیں اب علحٰدہ کی جارہی ہیں۔ بخشش علی اور اُس کے ہمراہی محل کی طرف آرہے ہیں۔ شاید اب وہ بدزبانی بھی کرے گا۔

بخشش علی کی آواز:- اُس رنڈی کو ادھر لاؤ! لاؤ! ہم اُس کو قتل کریں گے۔ وہ انگریزوں کی حامی ہو

جنھوں نے ہمارے مذہب کی تذلیل کی ہے اور ہماری عزت برباد کی ہے۔ اُس کو باہر لے آؤ! ورنہ اس منحوس جگہ پر کسی کی خیر نہیں۔

(رانی اپنی ساری سنبھالتی ہوئی ایک چھوٹے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتی ہے اور بالاخانہ کی طرف بڑھتی ہے۔ گنگا بائی اور راؤ آبا آگے بڑھکر اُسے روکتے ہیں لیکن وہ اُن سے چھوٹ کر دروازے پر پہونچتی ہے)

رانی :- (بالاخانہ سے) بخشش علی! میں بالکل تیار ہوں۔ اگر میری عزیز رعایا میری موت کی طالب ہے تو میں مرنے پر بالکل خوش ہوں۔ لیکن اسے جیل کے داروغہ! یاد رکھ کہ اگر میں اسوقت انگریزوں کی حمایت میں ایک کام بھی کرنا چاہتی ہوں تو تم نے ایسے بیس کام کئے ہیں۔ کیا تم نے اُن کی خوشامد نہیں کی اور بار ہا کتے کی طرح ان کے پاؤں نہیں چاٹے یہی لوگ جو اسوقت تمھارے پیچھے آوارہ کتوں کی طرح چل رہے ہیں تم سے کیا کچھ نقصان نہیں اُٹھا چکے ہیں۔ وہ اور دوسرے جھانسی والے ہمارے مابین فیصلہ کریں۔ جن غریبوں کو میں نے پوشاک دی، جن بھوکوں کو میں نے کھانا کھلایا اور جن فقیروں کو میں نے بھیک دی اور جن قیدیوں کو میں نے رہا کیا اگر میرا خون بہانا چاہتے ہیں بہائیں میں ایک لفظ شکایت زبان پر نہ لاؤں گی۔ لیکن اگر وہ میری زندگی نہیں ختم کرنا چاہتے تو یقیناً اُنھیں تم کو بخشش علی! تم کو اپنا شکار بنانا چاہیے۔ (ذرا سکوت ہوتا ہے اور ایک خفیف گنگناہٹ کی آواز آتی ہی) کیا؟ کیا تم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے؟ اچھا! میں فیصلہ کا انتظار کرتی ہوں اور اندر جاتی ہوں۔ جب تمھاری خواہش ہوگی میں تعمیل کے لئے فوراً آجاؤں گی۔ اگر باشندگان جھانسی جیل داروغہ بخشش علی کو رانی لکشمی بائی کے مقابلہ میں ترجیح دینا چاہیں تو یقیناً رانی لکشمی بائی کو موت سے ہم آغوش ہونا چاہئے۔

(جس وقت رانی بالاخانہ پر تقریر کر رہی تھی ماما صاحب ننگی تلوار لے کر مع تارا سنگھ کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ذرا ٹھہر کر ماما صاحب بالاخانہ کی طرف بڑھتا ہے۔ گنگا بائی مداخلت کرتی ہے اور واپس ہونے پر اصرار کرتی ہے۔ وہ سب جب تک تقریر ختم نہوئی مستعدی سے کھڑے رہے اس کے بعد رانی واپس ہوتی ہے اور کسی قدر عام تشویش میں کمی ہو جاتی ہے۔ گنگا بائی بالاخانہ پر اپنی جگہ واپس جاتی ہے ماما صاحب تلوار میان میں کر لیتا ہے۔ رانی تھک کر بنچ پر لیٹ جاتی ہے تھوڑی ہی دیر میں گنگا کسی قدر پہلے سے بلند آواز میں بات شروع کرتی ہے۔)

گنگا بائی :- وہ اپنے خطرناک بھوتوں کے ساتھ واپس جا رہا ہے۔ صحن بالکل خالی ہوگیا۔ اکثر لوگ آپ کی تقریر سُنکر واپس ہوگئے۔ لوگ اُس کو نہیں چاہتے لیکن اُس کے قصاب ساتھیوں سے ڈرتے ہیں۔

بخشش علی کی آواز :- (دور سے) سُن! بے شرم رنڈی! ابھی ہم تجھے چھوڑے دیتے ہیں۔ پہلے تیرے انگریز

رفیقوں کو صاف کردیں۔ تب تجھ کو سمجھیں گے۔ لیکن اگر اس اثنا میں تو نے ان بے دینوں کو ذرا بھی مدد دی تو ہم بے رحمی سے تجھے قتل کر ڈالیں گے۔ تیرا گوشت گدھوں کو کھلا دیں گے۔ خوب سمجھ لے جو بخشش علی کہہ رہا ہے۔ میں نے محافظ سپاہی محل کے گرد تعینات کر دئے ہیں اور اب کوئی بات مجھ سے نہ چھپ سکے گی۔

ماما صاحب:۔ کیا تم نے اُس کی آواز میں فرق کا امتیاز کیا۔ بیٹی! تم نے اُسے ڈرا دیا ہے۔ اب وہ ہم کو زیادہ نہ ستائیگا جیسے ہی جھانسی راج قائم ہونے کا اعلان ہوگا ہم اُس کی بھی فکر کریں گے۔ (وہ دیوان کی طرف معنی خیز نگاہ سے دیکھتا ہے) ابھی اُسے چھوڑ و۔ (رانی سے) بیٹی! میں ایک خوشخبری لایا ہوں۔ پیشواؤں کا علم پھر بلند ہو گیا ہے۔ اس بات کا اعلان ہوا ہے کہ تمام سچے مرہٹہ ناناصاحب کی اعانت کے لئے جمع ہو جائیں۔

رانی:۔ (بیٹھی ہوئی) مرہٹہ کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ مسلمان دہلی میں بہادر شاہ کو تخت پر بٹھا رہے ہیں۔

تاراسنگھ:۔ رانی صاحبہ! بہادر شاہ ضعیف شخص ہے اور وہ صرف برائے نام بادشاہ ہوگا ــــــ اصل حکمراں تو مرہٹہ سردار ہی ہوں گے۔

رانی:۔ کیا سندھیا اور ہلکر نے بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے؟

ماما صاحب:۔ نہیں بیٹی! لیکن جہاں تک معلوم ہے گوالیار اور اندور کے حالات سندھیا اور ہلکر کو باغی سپاہیوں کی اعانت پر مجبور کریں گے۔

(ایک بلند آواز سنائی دیتی ہے اور اُس کے بعد دوسری پھر ایک خوشی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کمرہ میں ہر شخص چونک پڑتا ہے اور رانی بیٹھ جاتی ہے۔ رانی پھر سیدھی لیٹ جاتی ہے اور آہیں بھرتی ہے اور بال نوچتی ہے اور اُس کا چہرہ تکیوں میں چھپا ہے۔ انند راؤ دوڑ کر اُس کے پاس آتا ہے اور روتا ہوا اُس کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔ اُسی وقت گنگا بائی بالاخانہ پر دوڑ کر جاتی ہے اور فوراً واپس آتی ہے۔)

گنگا بائی:۔ (اپنا ہاتھ آہستگی سے رانی کے ہاتھ پر رکھ کر اور غمگین آواز سے) بہن چپ رہو۔ اچھا ہے کہ اس قلعہ کی دیواریں ہماری توپوں سے گرا دی جاویں بجائے اس کے کہ دشمن کی توپیں گرا دیں۔

(رانی کے غم کو دیکھ کر سب آدمی اپنا سر جھکا دیتے ہیں اور راؤ آپا بظاہر بہت متاثر معلوم ہوتا ہے)

تیسرا منظر

(وقت شب تاریخ ۸ رجون ۱۸۵۷ء۔ شمع روشن تھی۔ کمرہ تاریک اور خاموش تھا۔ رانی پلنگ پر لیٹی ہوئی پنکھا جھل رہی ہے اور پریشان نظر آتی ہے۔ گنگا بائی رانی کے پاؤں کے پاس کھڑی ہے۔ انند راؤ اور

راؤ آپا چوکی پر بیٹھے ہوئے اسلحہ پر صیقل کر رہے ہیں -)

رانی :- (آہ بھر کر) کاش کے گنگا بائی میں نے تمھاری نصیحت مان لی ہوتی اور اس مصیبت سے بھاگ نکلتی کہ میرے دماغ کو تو سکون ہو جاتا -

گنگا بائی :- (افسوس کرتے ہوئے) بہن! ہونے والا ہو کے رہتا ہے - تمھاری تقدیر میں رنج تھا اور میری تقدیر میں اُس رنج میں شرکت کرنا - یہی ہمارا دھرم ہے - اور پھر بھاگ بھی کہاں جاتے - یہ مصیبت تو ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے -

رانی :- یہی کہکر میں بھی اپنے دل کو تسکین دیتی ہوں کہ اپنے ہی آدمیوں میں رہکر مصیبت کا مقابلہ کیوں نہ کروں ادھر اُدھر جاکر نئے خطروں میں کیوں پڑوں -

گنگا بائی :- بہن! میں جانتی ہوں کہ بغیر آپ کے جھانسی میں امن دشوار ہے - ہر شخص اپنے فائدہ کی فکر میں ہے

(بگل کی آواز باہر سے آتی ہے - رانی بیٹھ جاتی ہے اور ہر ایک ہوشیار ہو جاتا ہے -)

رانی :- یہ سپاہیوں کے سردار ہوں گے - میرے باپ نے مجھے اُن کو یہاں نے آنے کی دھمکی دی ہے گنگا بائی جلد میری زریں شال لے آؤ - ان بدتمیزوں سے رانی ہی کی طرح مجھے بات چیت کرنا چاہیں - (گنگا بائی کمرہ سے باہر جاتی ہے -) انند! تم تلوار اور زرہ بکتر لگالو - ہم کو ان معمولی سپاہیوں کو مرہٹہ شاہزادہ کی صورت دکھا دینا چاہئے

(رانی نے آئینہ دیکھا، اپنی ساری اور بال ٹھیک کئے - راؤ آپا نے انند راؤ کو اسلحہ پہنائے گنگا بائی واپس ہوتی ہے اور رانی کو شال اُڑھاتی ہے - پھر وہ سلیپر پہناتی ہے - دروازہ کھلتا ہے اور ملاصاحب معہ تارا سنگھ اور دو ہندوستانی حکام کے اندر آتے ہیں - اعدہ نمبر ۱۲ رجمنٹ نیٹو انفنٹری اور نمبر ۱۴ ارگلر کیولری کو احکام دیتے جاتے ہیں - جمعدار لال بہادر اور رسالدار لال محمد دونوں بنگال آدمی ہے افسران ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج ہے - اول الذکر ایک چمکدار سُرخ وردی جس پر سفید حاشیے ہیں پہنے ہوئے ہے اور ایک تلوار سفید پٹکے سے لٹکتی ہے - رسالدار سفید کوٹ کے ساتھ سفید برجس پہنے ہوئے ہے جو گھٹنے کے نیچے چست ہے اور اوپر کی طرف ڈھیلی اور ایک کرتہ پہنے ہے جو گھٹنوں تک نیچا ہے - منھ پر داڑھی ہے اور سر پر پگڑی جمعدار کی پگڑی سفید ہے اور رسالدار کی نیلی - اول الذکر فوجی بوٹ پہنے ہے اور دوسرا ہندوستانی جوتہ - رانی کھڑی ہے اور انند راؤ اُس کے پاس کھڑا ہے - گنگا بائی اور راؤ آپا پیچھے ہٹ جاتے ہیں - رانی کو دونوں افسر فوجی قاعدہ سے سلام کرتے ہیں - وہ اپنا ہاتھ کسی قدر اُٹھاتی ہے اور کسی قدر گردن جھکا کر سلام لیتی ہے - بعد ازاں خاموش کھڑی رہتی ہے - سیدھی لیکن گردن پیچھے گرائے ہوئے -

جمعدار :- (کرتے سے ایک دستاویز نکال کر) رانی صاحبہ ہم لوگ غیر مہذب آدمی ہیں اور محلات کی تہذیب سے ناواقف ہیں۔ اگر ہم خلاف تہذیب کوئی بات کریں تو معاف کئے جاویں۔ وقت کم ہے اور ہمیں دوسرے ضروری کام ہیں۔ اس لئے معاف کیجئے ہم اُس اعلان کو جو ہم نے آپ کے مقتدر باپ اور دیوان کے مشورہ سے تیار کیا ہے پڑھتے ہیں۔ (دستاویز پڑھنا شروع کرتا ہے) مخلوق خدا کی ہے دونوں مذہب ایک ہی آزادی رکھتے ہیں۔ ملک بادشاہ دہلی کا ہے۔ اور رانی لکشمی بائی اُس کے نام سے جھانسی میں حکمران ہے۔ (تارا سنگھ کو دستاویز دیکر) پس رانی صاحبہ آپ ان شرائط کو قبول کیجئے اور اپنی مہر لگا دیجئے۔

رانی :- جمعدار صاحب شرائط کیا ہیں۔

جمعدار :- ہم نے آپ کے مشیروں سے بار بار کہدیا ہے۔ ہمارے شرائط یہ ہیں کہ آپ ہم کو دہلی لیجانے کے لئے روپیہ آدمی سامان وغیرہ فراہم کر دیجئے۔ آپ جھانسی کے بادشاہ کے نام سے حکومت کیجئے۔ اور انگریزوں اور اُنکے رفقا کے حملوں کا مقابلہ کیجئے۔ آپ اس کام کے لئے حسب ضرورت فوج رکھئے۔ اور آپ وعدہ کیجئے کہ آدمی اسلحہ اور روپیہ سے ضرورت کے وقت آپ مدد کریں گی۔

رانی :- اور اگر میں انکار کردوں ؟

رسالدار :- (بدتہذیبی سے) تو آپ اور آپ کا لڑکا تخت سے علحدہ کردئے جاویں گے۔ یا شرائط قبول کیجئے یا علحدگی منظور کیجئے۔

جمعدار :- (اپنے ساتھی کے بازو پر اُس کو روکنے کے لئے ہاتھ رکھ کر) رانی! ہمارے دوست کو معاف کیجئے۔ اس کی زبان فوجی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے آپ سے فوری فیصلہ کا اصرار نہیں کیا ہے اور وقت میں توسیع کرتے رہے ہیں کیونکہ آپ کے والد نے آپ کو ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن اب انتظار کا موقع باقی نہیں ہے۔ آپ خود جانتی ہیں کہ جھانسی تباہی میں ہے۔ بدمعاش چور قاتل چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ اور لوگ ہم سے اصرار کرتے ہیں کہ کوئی معقول راج قایم ہو جانا چاہئے تاکہ جرائم کا انسداد ہو جائے۔ وہ یقین نہیں کرتے کہ یہ سپاہیوں کا قصور نہیں ہے کہ دوبارہ جھانسی میں راج نہیں قائم ہوا۔ وہ بار بار کہتے ہیں کہ اگر ہماری پیاری رانی کو تم گدی پر نہیں بٹھاتے ہو تو کسی اور کو بٹھا دو۔

رسالدار :- (بدتہذیبی سے) اور کل صورت حال اور بدتر ہو جائیگی جب انگریز ہم کو قلعہ سپرد کردیں گے۔ اگر کسی با اختیار آدمی نے اُن کی حفاظت نہ کی تو بخشش علی اور اُس کے ظالم رفقا اُن کو ذبح کر ڈالیں گے ہم اُن کی حفاظت کے لئے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ مزید براں ہمارے لئے حکم ہے کہ ہم قلعہ پر قبضہ کر کے فوراً دہلی روانہ ہو جاویں۔

ماما صاحب :۔ (نرمی سے) بیٹی! شاید تم کو معلوم ہوا ہو کہ ہمارے دوست (افسروں کی طرف اشارہ کرکے) سداشیو راؤ سے ملکر آئے ہیں جو تمھارے خلاف اور انند کے خلاف کچھ عرصہ سے سازش کر رہا ہے۔ یہ بدمعاش بہت گستاخ ہوگیا ہے اور راجہ گنگادھر کا رشتہ دار بنتا ہے۔ گدی کا بذات خود مالک بنتا ہے۔

جمعدار :۔ رانی! یہ درست ہے۔ اور ہم نے سداشیو راؤ سے کہدیا ہے کہ اگر آپ ہمارے شرایط نہ قبول کرینگی تو ہم اُس کے راجہ ہونے کا اعلان کردیں گے۔

(رانی ان کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے اور ہتھیلی پر ہتھیلی رکھ کر ہاتھ جوڑتی ہوئی تین بار گردن جھکاتی ہے اور کچھ کہتی ہے۔ پھر گھوم کر دونوں افسروں کی طرف دیکھتی ہے۔)

رانی :۔ جمعدار صاحب! قبل اس کے کہ میں اپنا آخری تصفیہ بتلاؤں مجھے ایک سوال کا جواب دو۔

جمعدار :۔ رانی صاحبہ پوچھئے!

رانی :۔ اگر میں جھانسی راج قایم کر بھی دوں تو اس بات کی کیا ذمہ داری تم لیتے ہو کہ تم پھر میرے خلاف بغاوت نہ کروگے جبکہ تم انگریزوں کے خلاف غدر کر رہے ہو؟

رسالدار :۔ (اپنے دوست کو الگ ہٹاکر) میں جواب دونگا۔ صرف ایک ذمہ داری۔ اور وہ یہ کہ آپ اُن لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں جو آپ کے لئے اپنی جان خطرہ میں ڈالیں۔ انگریزوں نے میری تیس برس کی ملازمت کے صلہ میں مجھے کیا انعام دیا۔ جوانی میں جنرل پولک کے ساتھ میں افغانیوں کے ملک کابل کو گیا اور انگریزوں کو قید سے رہا کرایا۔ بعد ازاں نپیر صاحب کے ساتھ سندھ میں خدمات انجام دیں اور میانی کی جنگ میں لڑا۔ بعد ازاں گف صاحب کی ماتحتی میں سکھ خالصہ کے مقابلہ میں مدد کی۔ اور فیروز پور میں لڑا۔ پھر فیروز آباد اور سبراؤں میں لڑا۔ سکھ جنگ کے بعد میں برما اور سکیم کے میدان میں گیا۔ میرے جسم پر چھ زخم ہیں۔ بائیں پاؤں کی دو انگلیاں ندارد ہیں صرف دائیں کان سے سُن سکتا ہوں اور اس سب کے صلہ میں مجھے کیا ملا۔ مجھے اپنا گھوڑا۔ سائیس اور وردی رکھنا پڑتی ہے اور اپنی خوراک کا خود انتظام کرنا پڑتا ہے۔ بحالت صلح میری تنخواہ میرے ذاتی خرچ اور بال بچوں کے خرچ کے لئے بالکل ناکافی ہے اور میدان جنگ میں جانے کے لئے مجھے ساہوکاروں کے پاس جانا پڑتا ہے۔ میری تمام جائداد رہن ہے اور میری بیوی کے اکثر زیور گروی ہیں۔ پھر بتلاؤ میں انگریزوں سے کس طرح محبت کروں؟

جمعدار :۔ رانی! میرے دوست رسالدار صاحب بدزبان ہیں لیکن ان کا دل بالکل پاک ہے۔ زبان ضرور تلخ ہے اور ہم سب قریب قریب ایسے ہی ہیں۔ ہم یہ ساری مصیبت برداشت کرلیتے۔ لیکن جب کارتوسوں میں سور کی چربی لگی دیکھی تو ہمارا صبر جاتا رہا۔ ایک سپاہی سب سے زیادہ اپنی عزت کا خیال رکھتا ہے۔

رسالدار :- (آگے جھپٹ کر) بادشاہ کی حکومت کے زمانہ میں اور خود مرہٹہ حکمرانوں کے زمانہ میں ایک جنگجو سپاہی اگر قابلیت اور عقل رکھتا تھا تو وہ ترقی پاکر فوج کا حاکم اور صوبہ دار بن سکتا تھا۔ لیکن اب ایک نوجوان سوار یا سپاہی کوئی امید ترقی نہیں کر سکتا۔ ہم سب کمپنی کے معمولی سپاہیوں سے زیادہ نہیں۔ سب مصیبت اور دقت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انگریزی حکام کرنل جرنل بن جاتے ہیں یا اچھی اچھی جگہوں پر متعین ہو جاتے ہیں۔ مجھکو اور میرے دوست کو سوائے ایک معمولی پنشن کے کیا اُمید ہے۔ وہ بھی جب زندہ رہے۔ بنگال فوج کے سپاہی اور سوار کمپنی کے علم کو ہندوستان بھر میں لئے گھوم رہے ہیں۔

(جب رسالدار گفتگو کرتا ہے بالاخانہ سے رونے چلانے کی آواز آتی ہے۔ رانی راؤ آپا کو جو کھڑکی کے قریب کھڑا ہے دیکھتی ہے اور یہ بھی دیکھتی ہے کہ صحن میں کیا ہو رہا ہے۔ جب راؤ آپا کی نظر اُس پر پڑتی ہے تو راؤ آپا کمرہ سے باہر جاتا ہے۔ آواز زیادہ بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ رسالدار کے الفاظ سنائی نہیں دیتے۔ رانی دروازہ کو غور سے دیکھتی ہے۔ کہ شاید راؤ آپا آتا ہو اور پھر سب کی طرف دیکھتی ہے۔ ناناصاحب دروازہ کی طرف جھکتا ہے۔ جس کو راؤ آپا کھولتا ہے اور الگ ہو جاتا ہے اور بہت سے قصبہ کے باشندے دربار کے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ سب خوفزدہ اور گھبرائے ہوئے۔ رانی کے سامنے زمین بوس ہوتے ہیں اور اپنے ماتھے زمین سے ٹکراتے ہیں اور سینہ ہاتھوں سے پیٹتے ہیں اور زار و قطار روتے ہیں جو لوگ باہر کھڑے ہیں وہ بھی رو رہے ہیں۔ راؤ آپا کمرہ کے اندر غل کے متعلق دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے)

رانی :- (غصہ سے) راؤ آپا! اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو جو سب کو اس طرح دربار میں گھس آنے دیا؟

راؤ آپا :- رانی صاحبہ! وہ کوئی خوفناک خبر سنانے آئے ہیں۔

رانی :- (قریب کھڑے ہوئے باشندوں سے) کیا ہے؟ بولو! کیا ہے؟ (اور زیادہ رونا پیٹنا شروع ہوتا ہے) خوف مت کرو۔ جو کچھ کہنا ہے کہو۔

پہلا باشندہ :- (رو کر) انگریز قیدی - رانی صاحبہ! انگریز قیدی - (سسکیاں لیکر)

رسالدار :- (غصہ سے) انگریز قیدی بیوقوف کہاں ہیں؟ بتلاؤ یہ غل و شور کیوں ہے ورنہ میں تم سب کی کھال کھینچ لوں گا۔

رانی :- (آہستہ سے) اُسے کہنے دیجئے۔ رسالدار صاحب! آپ اُس سے پھر سوال کر سکتے ہیں۔ ہاں! کہو! انگریز قیدیوں کی نسبت تم کیا کہتے تھے؟

سب باشندے :- (رو رو کر اور سینہ پیٹ کر) اُن کو قتل کر ڈالا۔ رانی صاحبہ! بے رحمی سے قتل کر ڈالا۔

مرد - عورت - بچے!

(خاموشی پھیل جاتی ہے اور رانی اور حکام ایک دوسرے کو بنظر تعجب غور سے دیکھتے ہیں)

راؤ آپا:- (سمجھانے کے لئے آگے بڑھکر) جب رسالدار صاحب اور جمعدار صاحب اس قلعہ سے سہ پہر کو روانہ ہوگئے تو فوراً اُن کے پاس بخشش علی آیا۔ محصور انگریز قیدیوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ اسلحہ رکھدیں اور قلعہ سے فوراً باہر نکل آویں اُن کو جھانسی سے بحفاظت دوسرے مقام پر پہونچا دیا جائیگا۔ انگریزوں نے شرائط قبول کئے۔ اور بخشش علی نے اُن کی محافظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ کیونکہ وہ ہنوز اُن کا ملازم تھا۔ اُس نے اور اُس کے بدمعاش رفقا نے انگریزوں کو معہ بیوی بچوں کے جوکھن باغ پہونچایا۔ اور وہاں اُن سب کو یہ کہکر کہ سپاہیوں کے سرداروں کا حکم ہے قتل کر ڈالا۔

(راؤ آپا کے بیان کے بعد رونا پیٹنا پھر جاری ہوا۔ رانی پریشان حال کمرہ میں ادھر اُدھر گھومتی ہے بال بکھیرتی جاتی ہے اور پیشانی پیٹتی جاتی ہے۔ دونوں افسر راما صاحب اور تارا سنگھ سرگوشی کے لہجہ میں تعریف کرتے ہیں۔ راؤ آپا لوگوں کو دلاسا دیتا ہے۔ انند راؤ رانی کو پریشان دیکھکر گنگا بائی کے پاس جاتا ہے اور اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔)

رانی:- (کسی طرف بغیر مخاطب ہوئے) افسوس! افسوس! ہم سب پر افسوس! اس بے رحمی اور وحشیانہ طریقہ کی خونریزی پر افسوس! ان مقتولین کی روحیں جب تک ہم زندہ ہیں ہمارے مسکن نہ چھوڑیں گی (غصہ سے) گیدڑو! دور رہو! تم اب مجھ سے کہنے آئے ہو۔ جب سب قصہ ختم ہو چکا۔ تم اُسوقت میرے پاس کیوں نہ آئے جب تم کو یہ علم ہوا کہ انگریز قلعہ حوالہ کرنے پر ہیں۔ بیوقوفو! بزدلو! دور ہو! یہاں سے چلے جاؤ!

(رانی سب کو بھگا دیتی ہے اور پنکھے سے بھاگنے کا اشارہ کرتی ہے وہ گرتے پڑتے بھاگتے ہیں رانی ایک خاص شاہانہ لہجہ میں مخاطب ہوتی ہے)

رانی:- جمعدار صاحب! آپ کے شرائط منظور ہیں اور اسی وقت سے جھانسی راج دوبارہ قائم ہوتا ہے اور رانی لکشمی بائی امور سلطنت منجانب کمار انند اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ رسالدار صاحب میرا پہلا حکم یہ ہے کہ آپ اور جمعدار صاحب جائیں اور بخشش علی کو معہ ان لوگوں کے قتل کر ڈالیں جو اس قتل عام میں شریک تھے۔ اُن پر رحم نہ کیا جائے فوراً قتل کر ڈالے جائیں۔ آپ کو روپیہ میرے خزانچی دیں گے۔ جائیے اور جب تک کام نہ ہو واپس نہ آئیے۔ (رسالدار اور جمعدار سلام کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں) دیوان صاحب! راج کے اعلان پر مہر لگائیے اور اس کو باہر جاکر پڑھ دیجئے۔ اور منادیوں کو ہر چہار طرف روانہ کیجئے کہ اعلان کر دیں کہ رانی لکشمی بائی بطور نائب گدی پر بیٹھ گئی ہے اور لوٹ مار اگر کوئی کرے گا تو سخت سزا دیجائے گی۔ اور یہ بھی اعلان کیا جائے کہ

بخشش علی اور اُس کے بدمعاش رفقا کو کوئی پناہ نہ دے کیونکہ راج نے اُن کے قتل کا حکم دیا ہے۔

(تارا سنگھ سلام کرتا ہے اور مہر لگاتا ہے اعلان اور مہر اُس کے ہاتھ میں ہے پھر بالاخانہ پر جاتا ہے اور باشندوں کو اعلان پڑھ کر سُناتا ہے)

رانی :- ابا! آپ اور راؤ آپا محل کی حفاظت کے لئے ایک گارڈ جلد مقرر کیجئے اور ایک فوج ہوشیار سپاہیوں کی تیار کیجئے۔ دیر نہ کیجئے۔ ہم کو معلوم نہیں کس وقت جنگ کرنا پڑے۔

(ماما صاحب اور راؤ آپا جھک جاتے ہیں اور باہر جاتے ہیں۔ رانی انند راؤ کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے جو گنگا بائی کے پاس سے جھپٹ کر آتا ہے اور اُس کے چمٹ جاتا ہے۔ تب وہ ایک ہاتھ انند راؤ کے سر پر رکھتی ہے اور دوسرا ہاتھ پھیلا کر قسم کھاتی ہے)

رانی :- اس وقت سے میں قسم کھاتی ہوں کہ آیندہ فوج کے ساتھ ہمیشہ جنگ میں آگے رہوں گی۔ آج بیگناہوں کا خون جھانسی میں میری مرضی کے خلاف مگر میرے نام سے بہایا گیا ہے۔ میں ہمیشہ اپنی رعایا کے لئے اپنا خون بہانے پر تیار رہوں گی۔

(ادہر اُسنے یہ تقریر ختم کی اور اُدہر اعلان سُنانے پر "رانی لکشمی بائی کی جے" کا نعرہ بلند ہوا)

(باقی)

بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی منصف سہارنپور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے، یا یوں سمجھئے کہ "در زبان شاعراں" حُسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے "آغاز عشق" سے لیکر "انجام عشق" تک جتنے عنوانات قایم ہو سکتے ہیں قایم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں عنوانات سینکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی کے دیوان کی ضرورت ہو۔ علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں۔

قیمت معہ محصولڈاک عہ ۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔

ملنے کا پتہ :- منیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ۔ یو۔پی

روحانئین مغرب کی شعبدہ کاریاں

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں ہم نے ظاہر کیا تھا کہ روحانئین مغرب جن طریقوں سے کام لیکر بقاء روح کو ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ یکسر مکر و فریب ہیں اور آج کی صحبت میں ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کس کس طرح لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

مشرق میں اہل تصوف سے زیادہ روح و روحانیت کا قایل کوئی نہیں، لیکن انھوں نے اس اصطلاح کو ہمیشہ اخلاق انسانی سے متعلق سمجھا اور روحانیت کا مفہوم ہمیشہ درستی اخلاق لیا گیا۔ انھوں نے وجود روح کا مفہوم کبھی یہ نہیں لیا کہ وہ اس دنیا کے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتی ہے اور تمام وہ خواہشات اپنے اندر رکھتی ہے جو عالم آب و گل میں تعلق جسم کے ساتھ اس کے اندر پائے جاتے تھے۔ برخلاف اس کے اہل مغرب چونکہ مادہ پرست ہیں اس لئے وہ وجود روح کے قایل ہوئے بھی تو اس شان کے ساتھ کہ روحیں آتی ہیں، باتیں کرتی ہیں، گاتی ہیں، ناچتی کودتی ہیں، عشق و محبت کرتی ہیں اور وصل و ہجر کی ہر اُس لذت و اذیت سے متاثر ہوتی ہیں جو اس دنیا میں پائی جاتی ہے۔

میں نے یہاں کے بعض کم علم و ناواقف حضرات کو نہایت فخر کے ساتھ یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "اب تو اہل مغرب بھی روحانیت کے قایل ہوتے جارہے ہیں اور عنقریب وہ اسلام کی ہر تعلیم کو اسی طرح ماننے پر مجبور ہونگے" لیکن ان کو مطلق اس کا علم نہیں کہ یوروپ میں یہ مشغلہ ایک کھیل سے زیادہ نہیں ہے اور جن ذرایع سے وہ وجود روح کو ثابت کررہے ہیں اُن کی حقیقت شعبدہ و فریب نظر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

مغرب میں ان روحانی کرشموں کی ابتدا ۱۸۴۸ء سے ہوتی ہے جب موضع ہیڈسول (نیویارک) کے ایک کاشتکار جان فاکس کے مزرعہ میں ان کی اولین نمایش کی گئی۔ فاکس کی کئی لڑکیاں تھیں جن میں ایک کا نام مارگرٹ فاکس تھا اور اسی نے سب سے پہلی مرتبہ ظاہر کیا کہ اس کے ذریعہ سے روحیں آتی ہیں اور اپنا حال بیان کرتی ہیں۔ اس کے بعد یوروپ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں اس نوع کے مظاہروں کا رواج بڑھتا گیا اور ایسی ایسی ترکیبیں اختیار کی گئیں کہ آخرکار کینن ڈایل اور سر آلیور لاج ایسے لوگوں کو بھی اس کا یقین آگیا اور اس

شدت کے ساتھ کہ ان مکاریوں کا راز کھلنے کے بعد بھی وہ اس خیال سے منحرف نہ ہوئے۔

روحانئینِ مغرب نے جن کو مدعی وجودِ روح کہنا زیادہ مناسب ہوگا روح و روحانیت کا کیا مفہوم لیا ہے اور کن کن طریقوں سے وہ وجودِ روح کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کی تفصیل غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

اہلِ مغرب نے چونکہ روحانیت کا تعلق، علی الرغم اہلِ مشرق، اخلاقیات سے نہیں رکھا ہے اسلئے حیات بعد الموت کی نسبت بھی اُن کے تمام خیالات کا مرکز وہی مادہ ہوا کرتا ہے جس کی پرستش وہ دنیائے آب و گل میں کیا کرتے تھے۔ اور اسی لئے وہ وجودِ روح کو بھی بالکل وجودِ جسم کی طرح مانتے ہیں یعنی روح کے جو حالات و کوائف تعلق جسم کی حالت میں پائے جاتے ہیں وہی جسم سے علٰحدہ ہونے کے بعد بھی باقی رہتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ملک کی روحوں کے جو پیغامات انھیں موصول ہوتے رہتے ہیں وہ بھی وہی توس کھن والی ذہنیت کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور جو تصویریں روحوں کی پیش کی جاتی ہیں ان میں بھی وہی آڑی مانگ، وہی اونچی ایڑی کا جوتہ اور وہی پوڈر لگا ہوا چہرہ سامنے آتا ہے جو اس دنیا میں نظر آتا تھا۔ الغرض وہ لوگ اس دنیا اور دوسری دنیا میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور یہاں وہاں کی زندگی ان کو بالکل یکساں نظر آتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ بیان ان طریقوں کا ہے جن کے ذریعہ سے وہ روحوں کا وجود ثابت کرتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے جس ذریعہ سے روح کی آمد ظاہر کی گئی وہ رگڑ یا کھٹ کھٹ کی آواز تھی اور سب سے پہلے فاکس کی لڑکیوں نے اس دھوکے کو استعمال کیا۔ صورت یہ ہوا کرتی تھی کہ لوگ ایک میز کے پاس خاموش بیٹھ جاتے تھے اور مارگرٹ فاکس ان سے کہتی تھی کہ جب مطلوبہ روح آئے گی تو وہ خود کھٹ کھٹا کر اطلاع دیگی چنانچہ تھوڑی دیر بعد یہ آواز خود بخود پیدا ہوتی تھی اور لوگوں کو روح کی آمد کا یقین ہو جاتا تھا۔ ایک زمانہ تک اس کا پتہ نہ چلا کہ یہ آواز کہاں سے آتی ہے لیکن ۱۸۸۸ء میں خود مارگرٹ نے اس راز کو ظاہر کیا اور بتایا کہ وہ یہ آواز اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے پیدا کرتی تھی۔

بعد کو یہ آوازیں لوگوں نے اور مختلف طریقوں سے پیدا کرنی شروع کیں یعنی پاؤں کے ناخن بڑھا کر ان کو ایک دوسرے سے رگڑنا یا میز کی لکڑی پر پوشیدہ طور پر ناخنوں کے تصادم سے آواز پیدا کرنا۔ بعض نے یہ ترکیب اختیار کی کہ گھٹنے کے زیریں حصہ میں لکڑی کا ٹکڑا باندھ لیتے تھے اور اُسے کرسی سے رگڑ کر آواز پیدا کرتے تھے۔ بعض نے میکانکی طریقے استعمال کرکے پنسل، گھڑی، چاقو اور قلم کے اندر سے یہ آوازیں پیدا کیں۔ ایک شخص نے اپنے جوتے کی ایڑی میں سیسہ کی ہتوڑی چھپا رکھی تھی اور اس کا تعلق ایک دھاگے سے رکھا تھا جو پتلون کے پائنچوں کے اندر اندر اس کے ہاتھ تک پہونچتا تھا اور جب وہ اس دھاگے کو کھینچتا تھا تو ہتوڑی کو جنبش ہو کر اس سے عجیب قسم کی آواز پیدا ہوتی تھی۔

زمانۂ حال میں بجلی کی مدد سے بھی یہ آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ یہ برقی آلات جیب میں چھپے رہتے ہیں اور بجلی کا بٹن قالین کے نیچے ہوتا ہے اور اُسے دبا کر کمرہ کے مختلف مقامات سے آواز پیدا کیجا سکتی ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ طلب ارواح کے مظاہرہ کا یہ ہے کہ میز کا ایک کونا یا دو کونے یا پوری کی پوری میز بلند ہو جاتی ہے اور لوگ اس کا راز نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے آمدِ روح کے قایل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مکر و شعبدہ یہاں بھی کام کرتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عامل اپنا ایک پاؤں میز کے پائے کے نیچے سرکا لیتا ہے اور اس کی جنبش سے میز کا ایک کونا اونچا ہو جاتا ہے اگر عامل کا کوئی دوسرا شریک بھی ہے تو وہ دوسرے کونے میں بیٹھکر یہی حرکت کرتا ہے جس سے میز کے دونوں کونے بیک وقت اُٹھ جاتے ہیں بعض عامل یہ ترکیب کرتے ہیں کہ ہاتھ کی اُنگلی میں مضبوط چھلا پہن لیتے ہیں اور جہاں بیٹھتے ہیں وہیں میز میں ایک چھوٹی سی کیل لگا دیتے ہیں تاکہ چھلے کے اندر اس کو ڈالکر میز کو اُٹھایا جا سکے۔ کبھی کبھی بجائے چھلے کے لوہے کی سلاخ استعمال کی جاتی ہے جو آستین کے اندر چھپی ہوتی ہے اور کلائی پر چمڑے کے تسمہ سے مضبوط کس دیجاتی ہے۔ چونکہ طلب روح کا مظاہرہ ہمیشہ تاریکی یا بہت کم روشنی میں کیا جاتا ہے اور دوسرے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے کہ میز کے اوپر اپنے ہاتھ اور نیچے اپنے پاؤں ایک دوسرے سے ملالیں، اس لئے ان کو کوئی موقعہ یہ معلوم کرنے کا نہیں ملتا کہ عامل کہاں اپنا پاؤں رکھتا ہے اور کس جگہ اپنا ہاتھ لیجاتا ہے۔

سائنٹفک میگزین کا مشتہرہ انعام حاصل کرنے کی غرض سے ایک مشہور عامل عورت مارگیری نے یہی عمل کیا تھا لیکن مغرب کا مشہور شعبدہ باز ہوڈنی وہاں موجود تھا، اس نے اس مکر کو معلوم کر لیا اور یہ راز فاش ہو گیا۔

اگر کوئی ایسا عامل آپ کو ملے تو آپ بہت بھاری میز اس کے سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ وہ کیا کہتا ہے اول تو وہ میز میں بیسیوں نقص نکال کر ہلکی میز طلب کرے گا اور اگر اس میں کامیاب نہ ہوا تو کوئی اور بہانہ کرکے ٹالدیگا، کیونکہ یہ عمل صرف ہلکی میزوں پر آسانی سے ہو سکتا ہے۔

(۳) تیسرا طریقہ مظاہرہ روحانیت کا یہ ہے کہ پوشیدہ سوالوں کا جواب دیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ عامل تین سادے کارڈ پیش کرکے ایک پر سوال لکھواتا ہے اور اسے باقی دو کارڈوں کے درمیان رکھ کر پیشانی کی طرف لیجاتا ہے اور سوال کا جواب دیتا ہے۔ اس میں ہتکھنڈا یہ ہوتا ہے کہ جن دو کارڈوں کے درمیان سوال والا کارڈ رکھا جاتا ہے اُن میں نیچے کا کارڈ فریم کی طرح کٹا ہوا ہوتا ہے اور پیشانی کی طرف لیجاتے ہوئے اُسے اس طرح لیجاتے ہیں کہ درمیانی کارڈ کی عبارت نگاہ سے گزر جاتی ہے۔

کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ لفافہ کے اندر سوال کا کاغذ بند کرا کے جواب دیتے ہیں اس کی ترکیب یہ ہے کہ

ایک رومال الکحل سے تر عامل کے پاس ہوتا ہے اور جب اس سے لفافہ کو تر کر لیا جاتا ہے تو اندر کی تحریر نمایاں ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر میں الکحل اُڑ جاتا ہے۔

کبھی سوال پیڈ (Pad) پر لکھوایا جاتا ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ پیڈ کے جس کاغذ پر سوال لکھا جاتا ہے اس کے نیچے کے کاغذ پر پرافن (Paraffin) ملا ہوا ہوتا ہے، اور جب اس پر باریک کوئلہ چھڑکا جاتا ہے تو تحریر نمایاں ہو جاتی ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ سوال کے کاغذ کو توڑ مروڑ کر ایک لفافہ کے اندر بند کر دیا جاتا ہے اور اُس لفافہ کو آگ میں جلا دیا جاتا ہے۔ اس میں یہ چالاکی ہوتی ہے کہ جس وقت لفافہ کو آگ میں جلاتے ہیں تو چمٹے سے وہ حصہ لفافہ کا دبا لیتے ہیں جہاں سوال کا کاغذ ہوتا ہے اور اس طرح وہ جلنے سے محفوظ رہتا ہے اس کے بعد اس کو کسی ترکیب سے دوسرے کمرہ میں جا کر پڑھ لیتے ہیں اور جواب دیدیتے ہیں۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ روحیں آکر تحریری پیام بھی دیتی ہیں اور لکھ کر سوالوں کا جواب دیتی ہیں۔ ماہرین فن نے اس کی تحقیق کر کے ثابت کر دیا ہے کہ عامل کے سواد خط اور ان روحانی تحریروں میں بہت مماثلت ہوتی ہے، اور یہ عمل اس طرح کیا جاتا ہے کہ پوشیدہ وغیر مرئی سیاہیوں کے ذریعہ سے پہلے ہی لکھ لیا جاتا ہے اور پھر گرمی، روشنی، پانی یا دواؤں کے ذریعہ سے وہ تحریر خود بخود اُبھر آتی ہے۔ اگر آپ شیشہ پر فرانسیسی کھریا مٹی سے کچھ لکھ کر صاف کر دیں تو مطلق کوئی تحریر نظر نہ آئے گی لیکن جب آپ منھ کے پاس لیجا کر اپنی سانس اس پر چھوڑیں گے تو تحریر نمایاں ہو جائے گی

(۵) روحانئین مغرب سلیٹ سے بہت کام لیتے ہیں اور طرح طرح کی چالاکیاں صرف کرتے ہیں۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ سوال کرنے والا اور عامل دونوں میز کے سامنے بیٹھتے ہیں اس حال میں کہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوتے ہیں اور میز کے نیچے پاؤں سے پاؤں ملے رہتے ہیں۔ وہیں نیچے ایک سلیٹ رکھی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کوئی امکان عامل کی چالاکی کا نہیں ہے لیکن پھر بھی سلیٹ پر تحریر ظاہر ہوتی ہے، اس کی ترکیب یہ ہے کہ عامل کے جوتے اور موزے کا پنجہ پھٹا ہوتا ہے اور پنجہ کی مدد سے پنسل کو حرکت دیکر لکھ دیتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سلیٹ پر سوال لکھ کر میز پر اسے اُلٹا کر کے رکھدیا جاتا ہے، لیکن میز کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ ایک پوشیدہ کھٹکے کی مدد سے سلیٹ کے برابر میز کے تختہ کا ایک حصہ سرک جاتا ہے اور پھر مختلف آئینوں کے ذریعہ سے جو میز میں لگے ہوتے ہیں وہ پڑھ لیجاتی ہے۔

بعض دفعہ چالاکی سے سوال والی سلیٹ بدلکر دوسری سلیٹ جواب والی رکھ دیتے ہیں کبھی دو سلیٹوں

سے کام لیا جاتا ہے یعنی معمول کو دو سلیٹ دی جاتی ہیں، کہ وہ انھیں صاف کرکے عامل کو دیدے، اور جب ان کو کھولا جاتا ہے تو اندر سے کوئی پھول نکلتا ہے، حالانکہ یہ بھی ہاتھ کی چالاکی ہے اور کچھ نہیں۔

بعض دفعہ دو سلیٹیں ملا کر رکھدی جاتی ہیں اور ان کے اندر چاک پنسل ہوتی ہے، معمول اور عامل دونوں ہاتھ سے دبائے رہتے ہیں لیکن تھوڑی دیر بعد جب ان کو کھولا جاتا ہے تو چاک سے لکھی ہوئی تحریر نظر آتی ہے، اسمیں عجیب وغریب چالاکی سے کام لیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ چاک پنسل خاص قسم کی طیار کی جاتی ہے جس میں لوہے کا بُرادہ بھی شامل ہوتا ہے اور پھر ایک قوی مقناطیس کے ذریعہ سے جو عامل کے ہاتھ میں ہوتا ہے اندر ہی اندر چاک پنسل کو حرکت دیجاتی ہے۔

اگر سلور نائٹریٹ یا کاسٹک پنسل سے کوئی عبارت سلیٹ پر لکھ کر تر کپڑے یا اسفنج سے صاف کردیجائے تو غائب ہوجائے گی لیکن سلیٹ خشک ہونے پر وہ پھر نمودار ہوجائے گی۔

بعض دفعہ یہ تماشہ دکھایا جاتا ہے کہ آٹھ چھوٹی چھوٹی سلیٹیں ایک جگہ رکھی جاتی ہیں اور اُن کے نیچے ایک بڑی سلیٹ ہوتی ہے۔ سایل سے کہا جاتا ہے کہ نصف سلیٹیں ایک طرف رکھدو اور پھر باقی نصف مع بڑی سلیٹ کے ان کے اوپر رکھدو۔ اس کے بعد عامل و معمول دونوں بڑی سلیٹ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اور پھر جب چھوٹی سلیٹو کو اُلٹ کر دیکھا جاتا ہے تو درمیان کی ایک سلیٹ پر پیغام درج ہوتا ہے، اس کی ترکیب یہ ہے کہ بڑی سلیٹ میں ایک، اور چھوٹی سلیٹ لگی ہوتی ہے جس پر پہلے سے تحریر درج ہوتی ہے اور بڑی سلیٹ پر ہاتھ رکھتے وقت عامل ایک کھٹکے کے ذریعہ سے اس کو علٰحدہ کردیتا ہے۔

(۶) بعض عامل کمرہ کی تاریکی میں مختلف ترکیبوں سے روشنیاں بھی پیدا کرتے ہیں اس کی ترکیب یہ ہے کہ کاغذ کی موٹی دفتیوں پر ایک طرف مختلف قسم کے نشانات مثلاً صلیب، ستارہ وغیرہ چمکنے والی سیاہیوں کے ذریعہ سے بنا دیتے ہیں اور جب وہ اپنی جادو کی چھڑی سے انھیں اُٹھا کر کسی جگہ لٹکاتے ہیں تو چمکنے والا حصہ پلٹ کر سامنے کردیتے ہیں۔ بعض مرتبہ کسی کونہ سے دفعتًا ایک روشنی پیدا ہوتی ہے اور غائب ہوجاتی ہے اسکی ترکیب یہ ہے کہ کسی مختصر سی چیز پر چمکنے والا مسالہ لگا کر کونہ میں چھپا دیتے ہیں اور پوشیدہ تاروں کے ذریعہ سے جن کا تعلق عامل کے پاؤں یا ہاتھ سے ہوتا ہے ان کو بلند کردیتے ہیں۔

(۷) روحوں کی موسیقی بھی معمول کو سُنائی جاتی ہے اس کی ایک ترکیب تو یہ ہے کہ میز کے نیچے تختے میں باجہ کا بکس نصب کردیتے ہیں اور تاروں کے ذریعہ سے موسیقی کے بعض ساز تیرتے ہوئے دکھاتے ہیں جب وقت یہ باجہ بجتا ہے تو کمرہ کی تاریکی کی وجہ سے معمول کو یہ معلوم کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ آواز کہاں سے آرہی ہے اور چونکہ کمرہ کی فضا میں وہ موسیقی کے ساز تیرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو یقین ہوجاتا ہے کہ یہ آواز یں

انھیں سازوں سے از خود پیدا ہو رہی ہیں۔ بعض مرتبہ گانے بجانے والے آڑ میں بٹھا دئے جاتے ہیں اور اُن سے یہ کام لیا جاتا ہے، کبھی ریڈیو گراموفون سے بھی یہ کام لیتے ہیں۔

(۸) بعض مرتبہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ عامل کا کوئی ہتھکنڈا شامل نہیں ہے اس کے ہاتھ پاؤں کرسی یا کسی ستون سے باندھ دیتے ہیں لیکن یہ سب شعبدہ و مکاری ہے کیونکہ رسی باندھنے کے طریقے اور ستون وغیرہ کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ عامل اپنے آپ کو خفیہ طور پر آزاد کر لیتا ہے اور پھر جو کچھ اسے کرنا ہوتا ہے کرتا ہے۔

(۹) کبھی روح کو روشن شعلوں، روشن دھویں اور نورانی لباس کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب فاسفورس وغیرہ چمکنے والی دواؤں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ کبھی عامل اپنے رومال پر یہ چیزیں مل لیتا ہے، کبھی ریشم کے گولوں پر لگا کر اپنے منھ سے نکالتا ہے، کبھی تمام لباس پر مل کر بالکل انسانی قد و قامت کے ساتھ کمرہ کی تاریکی میں نمودار ہوتا ہے۔

اسٹاک ہوم کا ایک شخص نلسن ریشمی گاز کے ٹکڑے جن پر روشن مادہ ملا ہوتا تھا، نہایت خوبی و صفائی سے نگل نگل کر منھ میں لے آتا تھا، اور کہا یہ جاتا تھا کہ روح اس کے جسم کے اندر سے نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی ہے۔

ایک عورت ایڈا انسی بٹ نے کینن ڈائل کو بھی اسی طرح دھوکا دیا تھا۔ اس نے کھانے کی میز کا تختہ علحدہ کر دیا اور ڈھانچہ کے اندر اس نے بہت سی روشن روحوں کو پیش کیا، اس تماشہ میں بھی اسی چمکدار مسالہ سے کام لیا گیا تھا۔ جو لوگ روح بنکر آتے ہیں ان کا لباس بالکل سیاہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ جب کمرہ میں وہ سیاہ حصہ سامنے کر دیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ غائب ہو گئے اور جب دوسرا حصہ سامنے لے آتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ نمودار ہو گئے۔

بعض دفعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دفعتہً کمرہ کے اندر سخت جھونکا نہایت سرد ہوا کا آگیا۔ اسکی ترکیب یہ ہے کہ برف کے ٹکڑے ٹین کے ظروف میں بند کر کے چھپا دئے جاتے ہیں اور بجلی کے پنکھے کے ذریعہ سے ان کی برودت و نمی کو کمرہ میں پھیلا دیا جاتا ہے۔

(۱۰) روحوں کی تصویریں بھی لیجاتی ہیں اور اس سے لوگ بہت متاثر ہوتے ہیں، درانحالیکہ یہ سب شعبدہ ہے اور اس کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں، کبھی پہلے کی اکسپوز (Expose) کئے ہوئے پلیٹ سے کام لیا جاتا ہے، کبھی لنس میں نشان دیکر خاص اثر پیدا کیا جاتا ہے، کبھی نصف پلیٹ پہلے سے اکسپوز کی ہوئی ہوتی ہے۔ الغرض اس کی بہت سی ترکیبیں ہیں جن کی وضاحت اس لئے مناسب نہیں کہ وہ فن فوٹوگرافی سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا سمجھنا آسان نہیں۔

بعض مرتبہ پردہ پر روحوں کی شکل نمودار ہو جاتی ہے، اس کی ترکیب یہ ہے کہ پہلے ہی سے اس پردہ پر بعض دواؤں سے تصویر بنا دیجاتی ہے اور پھر اس کو مختلف طریقوں سے اُبھار دیتے ہیں۔

اس عمل کے لئے سلفیٹ آف آیرن۔ سلفٹ آف کاپر۔ نائٹریٹ بسمتھ اور پرو شیٹ آف پوٹاس وغیرہ مختلف دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۱۱) بعض عامل، سایل کے بعض نہایت ہی پوشیدہ حالات زمانۂ ماضی کے بتاتے ہیں اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ وہ مختلف طریق پر پہلے ہی سے حالات کی تفتیش کر لیتے ہیں اور ان حالات کے معلوم کرنے میں وہ کافی روپیہ صرف کرتے ہیں۔

مجموعۂ استفسار و جواب جلد اول

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی ایک جلد ہے جس کے ۵۱۲ صفحات میں علم و ادب، تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے۔ اس جلد میں تقریباً ۲۰۰ مسایل پر آپ کو وہ مواد ملیگا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:

مسئلۂ جبر و اختیار ۔۔۔ خواب کی حقیقت ۔۔۔ معاد و خلود ۔۔۔ طبقۂ نسواں اور رغزلگوئی۔

برج بابل ۔۔۔ فاسسٹ جماعت ۔۔۔ سامری کون تھا ۔۔۔ باغ ارم کی حقیقت۔

فلسفۂ محبت ۔۔۔ بھوت پریت ۔۔۔ اصحاب کہف ۔۔۔ سالویشن آرمی ۔۔۔

ہالہ کا سبب ۔۔۔ معجزہ و کرامات ۔۔۔ فرقۂ معتزلہ ۔۔۔ مذہب و عقل ۔۔۔

طوفان نوح ۔۔۔ یاجوج و ماجوج ۔۔۔ برہمو سماج ۔۔۔ طبقۂ نسواں اور تعلیم۔

مریخ کی حقیقت ۔۔۔ منصور حلاج ۔۔۔ چند الفاظ کی تحقیق ۔۔۔ اصطلاحات تصوف کا ترجمہ۔

قیمت معہ محصول خریداران نگار سے ؏ ۔۔۔ غیر خریداران سے ؏۔

مینجر نگار لکھنؤ

دُم دار ستارہ

دُم دار ستارہ نہایت آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا تھا اور اپنی ضیا باریوں سے تمام دنیا کو منور کر رہا تھا، ہر شخص کا دل اُس کی روشن دُم دیکھ دیکھ کر سہما جاتا تھا، امیر و غریب ادنےٰ و اعلےٰ غرضکہ ہر کس و ناکس اُسکا نظارہ کر رہا تھا اور طرح طرح کی خیال آرائیوں میں مصروف تھا، ایک دوسرے کو اس آسمانی نشانی کے دیکھنے کی دعوت دیجا رہی تھی اور ہر شخص پروانہ وار اُس کو دیکھنے چلا جا رہا تھا۔

جہاں ایک عالم اُس کے ظہور پر اپنے ذوق و شوق کا اظہار کر رہا تھا وہاں دو ہستیاں ایسی بھی تھیں جو ذرہ برابر اُدھر ملتفت نہوئیں، یہ دو ہستیاں ایک کم عمر بچہ اور اُس کی ماں تھیں، بچہ کے سامنے چربی کی ایک شمع روشن تھی، جس میں اُس کی ماں ایک قسم کی لیک دیکھ رہی تھی اور وہ اُسے دیکھ دیکھ کر اس خیال سے سہم رہی تھی کہ شاید بچہ کچھ ہی دنوں کا مہمان ہے، یہ ایک فرسودہ وہم تھا جس میں وہ گرفتار تھی اور اُسے خبر نہ تھی کہ اُس کا بچہ اپنی عمر طبعی کو پہونچے گا اور ساٹھ سال کی مدت کے بعد دُم دار ستارہ پھر ایک مرتبہ اُسی کے سامنے نمودار ہوگا۔

لڑکے نے اُس ستارہ کی طرف ذرا بھی التفات نہ کیا۔ اُس کے سامنے صابن کے پھین سے لبریز ایک ظرف رکھا ہوا تھا، وہ اُس میں اک مٹی کی نلکی کو بار بار ڈبوتا اور پھر اُس کے دوسرے سرے کو اپنے لبوں پر رکھکر بلبلے اُڑانا شروع کرتا، بلبلے ایک عجیب دلفریب انداز سے ہوا میں تھرتھراتے دکھائی دیتے تھے اور پھر وہ دم کی دم میں زرد سے سُرخ اور سُرخ سے سبزی میں تبدیل ہو جاتے۔

"خدایا تیری عمر کے سال اتنے ہوں جتنے کہ یہ بلبلے ہیں" ماں نے بچہ کو یہ دعا دی "آہاہ! اتنے سال۔ صابن کا پانی کیا ابھی ختم ہوا جاتا ہے" بچہ نے معصومانہ انداز میں جواب دیا اور اپنے شغل میں مصروف ہوگیا۔

"وہ دیکھو ایک سال اُڑتا ہے۔۔۔ اے لو وہ دوسرا سال" بچہ ہر بار ٹوٹتے ہوئے بلبلوں کو دیکھکر چلا اُٹھتا چند بلبلے سیدھے اُس کی آنکھوں میں چلے گئے، خدا جانے اُن میں کیسی تیزی تھی کہ اُس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسوؤں کے قطرے بہنے لگے، ہر ایک بلبلے میں بچہ کو اپنا درخشاں مستقبل دکھائی دے رہا تھا۔

"ہمسائیوں نے کہا کہ وہ دیکھو ستارہ اب بہت صاف اور نمایاں ہے، کیا تم لوگ کمرہ میں یونہی

بند بیٹھے رہو گے؟" یہ سنتے ہی ماں نے بچہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور باہر چلی گئی۔

بچہ نے اس آتشین گیند کو پہلی مرتبہ دیکھا، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ قریب تین گز لانبا ہے اور کچھ لوگ اُسے ہزاروں گز لمبا سمجھ رہے تھے، ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق رائے زنی کر رہا تھا۔ لوگوں کو یقین تھا کہ دُم دار ستارہ دو نسلوں کے گزرنے کے بعد پھر نمایاں ہوگا۔

جب دوسری بار اُس کا ظہور ہوا تو واقعی اُن میں سے اکثر اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ وہ بچہ جس کی نسبت ماں کا خیال تھا کہ بہت جلد دنیا سے سدھار جائے گا، ضعیف العمر ہو چکا تھا اور اُس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ سفید بال بوڑھاپے کے پھول ہوتے ہیں۔ وہ اب ایسے کتنے پھولوں کا مالک تھا۔ اب وہ ایک بوڑھا مدرس تھا، لڑکے اُنسے ایک عالم متبحر تصور کرتے تھے اور اُن کا عقیدہ تھا کہ وہ تاریخ و جغرافیہ کے علاوہ تمام سیاروں کے حال سے بھی بخوبی واقف ہے۔

"فنا اور بقا کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ہمیں دنیا کی تمام اشیاء کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہئے،" اُستاد نے طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہا۔ اُس کی گفتگو کا رُخ دُم دار ستارہ کی طرف بھی پھرا۔ اُس نے بچوں کو سمجھایا کہ پُرانے لوگ دُم دار ستارہ کی نسبت کیا کیا خیالات رکھتے تھے۔ اُس نے یہ بھی بتلایا کہ دم دار ستارہ والا سال شراب والوں کے لئے نہایت موزوں ہے، کیونکہ شراب میں کتنا ہی پانی ملایا جائے کوئی تمیز نہیں کر سکتا۔

کوئی دو ہفتہ فضا ابر آلود رہی اور ستارہ نظروں سے پوشیدہ رہا۔ اُستاد ایک چھوٹے سے حجرہ میں جو مدرسہ سے متصل تھا خاموش بیٹھا تھا، اُس کے ایک طرف کونے میں اُس کے باپ کے وقت کی شکستہ گھڑی رکھی تھی۔ کوئل جو پہلے ایک ایک گھنٹہ کے وقفہ پر سامنے آکر سریلی آواز سے بولتی تھی گھڑی کے ڈبے کے پیچھے خاموش، اور گونگی پڑی تھی۔ مگر اُسی زمانہ کا پیانو اب بھی اچھی حالت میں تھا۔ اگرچہ امتدادِ زمانہ سے اُسکے تاروں کا وہ ہلکا پن اور ترنم جاتا رہا تھا پھر بھی اُس پر تمام انسانی نسلوں کے گیت گائے جا سکتے تھے۔

دُم دار ستارہ کو دیکھ کر بڈھے کی آنکھوں میں تمام گزشتہ مسرت و غم کے واقعات کا نقشہ پھر گیا، اُسوقت اُسے وہ الفاظ بھی یاد آئے جو اُس کی ماں نے شمع میں ایک قسم کی لپک دیکھ کر کہے تھے۔ اُس کے دل میں اُن رنگین بلبلوں کی یاد بھی تازہ ہو گئی جو اُسکو اسقدر محبوب تھے۔ اُن میں ہر ایک اُس کی عمر کا ایک سال تھا۔ وہ اُن کی رنگینیاں دیکھ کر کیسا خوش ہوتا تھا۔ اُن میں اُسے اپنی معصوم مسرتیں اور شباب کی سرمستیاں اور تمنائیں جھلکتی نظر آتی تھیں۔ آہ! مستقبل کا حباب بھی کیسا طلسم تھا۔ اُسوقت پیانو کی نغمہ ریزیاں اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں ——

اُس کے خیالی ساز سے وہ نغمہ بھی نکل رہا تھا جسے اُس کی ملازمہ نے گایا تھا اور اُسے اُسوقت وہ گیت بھی بے چین کرنے لگا جو پہلی مرتبہ رقص و سرود کی محفل میں اُس کے سامنے گایا گیا تھا۔ الغرض ماضی کے تمام دلچسپ مناظر اُسکے

پیش نظر ہو گئے اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اُس کی آنکھیں کھڑکی کے باہر لگی تھیں کہ یکایک بادل کا ایک ٹکڑا ہوا میں تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ اور ساتھ ہی دُم دار ستارہ چمکتا ہوا نظر کے سامنے آ گیا۔ اُس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک روز قبل ہی اُسے دیکھ چکا ہے اور اس مختصر وقفے میں ایک پُشت ختم ہو چکی ہے۔ تب وہ بچہ تھا اور اُس کو بلبلوں میں اپنا مستقبل چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اب مستقبل نہ تھا بلکہ ماضی اور تیرہ و تار ماضی۔ اُس کی آنکھیں دمک اُٹھیں اور اُس نے اپنا ہاتھ بے اختیار باجے پر رکھ دیا، پیانو بج رہا تھا مگر اس طرح گویا اُس کا ایک تار ٹوٹ گیا ہے۔

"فوراً آؤ دیکھو آسمان کتنا صاف اور شفاف ہے۔ ستارہ کتنی دلفریبی سے چمک رہا ہے" ہمسایوں نے پکار کر کہا۔

اُستاد نے کچھ جواب نہ دیا۔ کیونکہ وہ اُسے دیکھنے سے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا۔ اُس کی روح اُس فضا سے بھی اُونچی جا چکی تھی جہاں ستارہ چمک رہا تھا۔ محلوں، جھونپڑوں اور بازاروں میں ہر جگہ لوگوں کی نگاہیں ستارہ پر لگی ہوئی تھیں لیکن اُستاد کی روح اُن تمام اپنے اجل رسیدہ عزیزوں سے جن سے ملنے کے لئے وہ اسقدر بیقرار تھا، ہم آغوش ہو چکی تھی۔

(انڈرسن)

(ترجمہ)

تحسین الدین علوی۔ بی۔ اے

مکتوبات نیاز

ادب و انشار کی دنیا میں وہ چیز جس کی مثال آپ کو اُردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و محاکات، شوخی و رنگینی سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو صرف

مکتوبات نیاز

میں نظر آئیں گی۔ اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات کاغذ دبیز۔ قیمت معہ محصول ۱۲/ ۱/۴ — کتاب مجلد شایع ہوئی ہے۔

مینیجر نگار، لکھنؤ

معجزہ و خوارق عادات کی حقیقت

(شاہ ولی اللہ کے نقطۂ نظر سے)

اسلام حقیقت میں دنیا کا بہترین مذہب محض اسی وجہ سے ہے کہ وہ دین و دنیا کو دو علٰحدہ چیزیں قرار نہیں دیتا جس کی تفریق کی بنا پر قوموں کو زندگی بسر کرنا دشوار ہو رہی ہے، وہ مذہبیت کو سیاست و معاشرت پر اسقدر غلبہ دینا نہیں چاہتا کہ اس کے پیرو "انسان" کہلانے کی بجائے "روح" اور "فرشتہ" بنکر ظاہر ہوں، وہ اپنے پیروی کرنے والوں کو صرف "طریق معاشرت" اور ان کی تخلیق کا حقیقی نشاء "ہمدردی" کی تعلیم دیتا ہے، وہ اپنے ہر نظریہ کو عقلی دلایل کے ساتھ پیش کرتا ہے، ہر چیز فطرت کے موافق ظاہر کرتا ہے، غور و تدبر کی دعوت دیتا ہے، وہ خدا کی ہستی کو زبردستی نہیں منواتا بلکہ اس کی ضرورت اور اس کے وجود کے لئے سیکڑوں عقلی دلائل صراحت اور تمثیل کے ساتھ پیش کرتا ہے، رسول کو ایسی ان ہونی نشانیاں دیکر نہیں بھیجتا جسکو دیکھکر لوگ خوف یا وقتی مصالح کی بنا پر تسلیم کرلیں، بلکہ اس کی نبوت کا ثبوت محض وہ دستور العمل ہے جس کی تلاش میں ہر انسان سرگرداں ہے، اور جس کے حصول کے بعد ہر فلسفی کو تسکین ہوتی ہے

لیکن ہمارے علمائے سلف اور حکیمانِ اُمت نے تفکر و تدبر کو حرام قرار دیدیا اور اپنی اُلٹی سیدھی حراش و خراش سے اس کو ایسا تنگ اور ٹیڑھا بنا دیا کہ ہر چیز مضحکہ خیز حد تک قیاس و گمان کی حد سے باہر پہونچ چکی ہے حتیٰ کہ آپ خدا اور اس کے رسول کو بھی خود سے ناآشنا اور اجنبی خیال کرنے لگیں گے۔

مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ پر جب آپ نظر ڈالیں گے تو دیکھیں گے کہ اُسوقت نہ تو اس قسم کی جنگ زرگری کا بازار گرم تھا اور نہ کفر سازی کی مشینیں چل رہی تھیں، لیکن اس کے بعد بہتر چھوڑ بہتر ہزار فرقہ پیدا ہوگئے قسم قسم کے عقاید بنائے، ہر شخص کے زعم میں دوسرا کافر ہوگیا، قرآن و سنت کی بجائے لوگوں نے اپنے اپنے اُصول اور اپنے زور قلم کے منوانے میں عمریں صرف کردیں، غرض یہ کہ ہر طرح اسلام کو مسخ ہی کرتے گئے خواہ وہ خود کو اہل قرآن کہتے ہوں یا اہل حدیث، یا اہل فقہ، یا اہل عدل، آہستہ آہستہ مسخ شدہ دین جمہور کے عقائد میں اسطرح

منطبع ہوگیا کہ جو اسلام کی حقیقت سے واقف ہوتے تھے وہ بھی جمہور کے خوف سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اگر کسی نے جرأت کر کے کچھ کہا بھی تو اس کے نتائج کی تاریخ کے خونی اوراق شہادت دیں گے۔

امام غزالی نے اسّی کتابیں علوم دین پر تحریر کیں لیکن حقیقت کا اظہار کسی میں بھی نہ کر سکے، نہایت دعوے کے ساتھ احیاء العلوم کو پیش کیا لیکن جہاں حقایق و معارف کو کھول کر بیان کیا جمہور یا یوں سمجھئے کہ ملاؤں کے مخترعہ اُصول کے خلاف چلے، اسی پر اعتراضات کئے گئے، کفر کے فتوے لگائے گئے، اور پھر بھی وہ احیاء میں واضح حقیقت نہ لکھ سکے، اور یہ لکھنا ہی پڑا کہ اس میں بھی حقیقت سے پردہ نہیں اُٹھایا ہے جو اصل باتیں ہیں وہ اس میں نہیں ہیں۔ آخر ایک کتاب مضنون لکھی لیکن اس کے لئے اپنے شاگردوں کو سخت تاکید کر دی کہ جمہور درکنار علماء کو بھی نہ دکھایا جائے صرف سینہ بسینہ جو لوگ اس کے اہل ہوں اُن تک پہونچایا جائے۔

سب سے آخر دور میں شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم پیدا ہوئے جن کے لئے مشہور ہے کہ ہندوستان میں حدیث کی اشاعت کا سہرا انھیں کے سر ہے، شاہ صاحب نے بھی کئی کتابیں لکھیں لیکن وہی مشکلات اب بھی موجود تھیں چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔ "بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہوا کرتی، اعمال اور ان کی جزائیں جو منجانب اللہ مقرر ہیں کوئی مناسبت نہیں ہے یہ گمان بالکل فاسد ہے اور قرآن و سنت و نیز اسوۂ صحابہ سے اس کی تکذیب ہوتی ہے" (صفحہ ۵ مطبوعہ مصر) "اسرار دین کی تدوین بہت ضروری ہے اور کثیر فائدوں کی حامل ہے، ایمان لانے کے بعد اس علم سے دلی اطمینان زیادہ بڑھ جاتا ہے"۔ لیکن امام غزالی کی طرح شاہ صاحب بھی حجۃ اللہ میں حقیقت کو بے نقاب نہ کر سکے اور جمہور کے سامنے حجۃ اللہ میں سابقہ شاہراہ سے ملا ہوا ایک راستہ اختیار کیا جہاں سے پہلا راستہ بھی نظر آ رہا ہے اور مسافر جب چاہے اس راستہ کو چھوڑ کر ایک لمحہ میں قدیم شاہراہ پر چلا جائے۔

اس کے بعد ایک مختصر رسالہ "تاویل الاحادیث" تحریر کیا جس میں بہت ہی مجمل طور سے چند مسئلوں کو تحریر کیا لیکن جو کچھ ہے وہ بھی حقیقت کی رہنمائی اور تحقیق کا راستہ قائم کرنے کے لئے بہت کافی ہے، شاہ صاحب نے اس رسالہ میں انبیاء کے قصے اور ان کے معجزات کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے اور جمہور کے خلاف نہایت بیباکانہ قدم اُٹھایا ہے، ہمیں اسوقت اسی کتاب پر ایک نظر ڈالنا مقصود ہے۔

شاہ صاحب اس کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "جب خدا اپنا علم نازل کرتا ہے تو وہ بطریق مجاز و کنایہ نہیں ہوتا بلکہ اس طرح ہوتا ہے کہ طبیعت اس کو جائز سمجھے مطلب یہ کہ انسان کے حواس میں جب کسی ہونے والی حالت کا علم دیا جاتا ہے تو وہ خواب وغیرہ کی صورت میں ظہور پاتا ہے، اس کے بعد صفحہ ۲ پر اور وضاحت کرتے ہیں "جب خدائے تعالیٰ کوئی "خرق عادت" کسی تدبیر کے واسطے ظاہر کرتا ہے تو اسے

عادت کے ضمن میں ظاہر کرتا ہے۔" (خلاف فطرت کوئی واقعہ نہیں ہوتا)

چونکہ "خرق عادت" کا لفظ اصطلاح میں خلاف فطرت وقوع کے لئے استعمال ہو رہا ہے اس لئے اس شک کو رفع کرنے کے لئے خرق عادت کی بھی تعریف فرمادی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالہ ہی اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے لکھا گیا ہے کہ انبیا کو دنیا میں شعبدے باز بنا کر نہیں بھیجا گیا، دنیا میں کوئی واقعہ خلاف عادت وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ "سچ یہ ہے کہ جب خرق نام رکھا جاتا ہے تو وہ اُمور عادیہ ہی سے ہوتا ہے مگر چونکہ اسکے اسباب قلیل الوقوع ہوتے ہیں اس لئے وہ قلیل ہی واقعہ ہوتا ہے اور عام لوگوں کو اس کی توقع نہیں ہوتی اس لئے خوارق کہتے ہیں، اور اکثر خارق کے لئے نظیر ہوتی ہے اور عام لوگوں کے لئے مالوف ہوتی ہے، لیکن عام لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے (صفحہ ۸۰)

قرآن شریف میں جتنے معجزوں کا تذکرہ کیا ہے مثلاً عاد و ثمود کی ہلاکت، شق القمر، دریا کا پھٹ جانا وغیرہ حقیقت میں یہ سب اسباب عادیہ سے وقوع پذیر ہوئے تھے کہیں زلزلے اور باد و باران سے ہلاکت ہوئی جبکہ اسباب ارضی مواق ہو چکے تھے اور کبھی اجرام فلکی کا اثر تھا بغیر اس کے کوئی واقعہ ظاہر نہیں ہوا۔

قوم لوط کی تباہی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :- "جتنے عذاب کائنات فطرت کی طرف سے آتے ہیں اُسی وقت آتے ہیں جبکہ کواکب کا اتصال وحشت ناک ہوتا ہے، پانی بند ہو جاتا ہے اور آسمان و زمین میں کافی مواد ایک مدت تک جمع ہو جاتا ہے"۔ (صفحہ ۲۵)

یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں "ان کی تقدیر میں مصیبت و بلا اور والد سے جدائی اسی لئے تھی کہ اسباب سماوی اسی کے خواہاں تھے" (صفحہ ۲۵)

نوح علیہ السلام کے طوفان کی تاویل میں لکھتے ہیں کہ جب کشتی وغیرہ سب سامان طیار ہو گیا تو "تدبیر الٰہی ایک ہولناک واقعہ کا فضا کی طرف سے انتظار کر رہی تھی، جس کے واقع ہونے پر انھیں عذاب دے چنانچہ عام طوفان آنے کے لئے اسباب سماوی و ارضی موافق ہو گئے تو خدا نے اپنا حکم جاری کیا" صفحہ ۱۵

حضرت موسیٰ کے معجزات میں مچھلی کے زندہ ہونے کا قصہ تحریر کر کے لکھتے ہیں "حضرت موسیٰ خستہ ہو کر سو گئے تھے اور یوشع وضو کرنے بیٹھے تو پانی کی بوندیں مچھلی پر گر پڑیں اور پانی میں یہ خاصیت ہے کہ وہ پانی کے جانور کو زندہ کر دیتا ہے" (صفحہ ۴۳)

حضرت عیسیٰ کے مردہ جلانے کی نسبت لکھا ہے کہ "جو نفس جسم سے تعلق رکھتا تھا اس کا تعلق وہم کا سا تھا نہ حیات کا سا" (صفحہ ۵۹)

معجزہ شق القمر کی نسبت شاہ صاحب فرماتے ہیں "یہی ضرور نہیں کہ انشقاق ذات قمر ہی میں ہوا ہو، بلکہ

ممکن ہے کہ دھوئیں یا ستاروں کے ٹوٹنے یا کسوف و خسوف کی طرح ہو جیسا کہ لوگ دیکھتے رہتے ہیں اور عربی زبان میں اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا کہ ذات شے میں واقع ہوا ہے اور میرے خیال میں اس حادثہ کا سبب یہ ہے کہ اجزائے مائیہ صیقلیہ ملتمہ، سطح واحد کی طرح جمع ہو گئے ہوں گے جس کے پیچھے پہاڑ یا ابر غلیظ آئینہ کی طرح ہوگا اور اس میں چاند کا عکس دیکھ کر لوگ دو چاند سمجھے ہوں، اور کبھی وہ بھی منطبع ہو جاتا ہے جو آسمان میں نہیں ہے اور کبھی چاند چھپ جاتا ہے اور فضا میں دو ٹکڑے نظر آتے ہیں اور ان سب صورتوں کی مثال وہی کسوف و خسوف وغیرہ ہے (صفحہ ۱۰)

دوسری چیز شاہ صاحب یہ ثابت کرتے ہیں کہ نبوت، ولایت یہ سب قوت نفس سے متعلق ہیں جس قدر نفس میں صفائی اور روح کی طاقت وسیع ہوگی اسی قدر نظام سماوی (بالفاظ دیگر ملاء اعلیٰ) سے زیادہ اتصال ہوگا چنانچہ ہونے والے واقعات کی خبر کے لئے کہتے ہیں کہ کوئی چیز بغیر اسباب کے پیدا نہیں ہوتی لہٰذا "نظام طبیعی کا پہچاننے والا اگر زکی نفس ہے تو اسباب کے شروع ہوتے ہی حادثہ کی پیشین گوئی کر دے گا اگر کم زکی ہے تو کچھ دیر میں اور جو اس سے کم زکی ہو تو وہ اس سے بھی دیر میں پہچانے گا" (صفحہ ۶۶)

"جن لوگوں کو قضا و قدر کی شناخت میں کچھ خصوصیت تھی جیسے کاہن یا نجومی اور راجنہ انھوں نے اپنے علم کے ذریعہ آپ کی صداقت اور پیغمبری کی تصدیق کی تھی" (صفحہ ۶۷)

"نیک بخت اور عادل بادشاہ اپنی استعداد کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہے اور اس سے یقیناً امور خارقہ صادر ہونگے جس شخص میں ایسے اخلاق حمیدہ جمع ہو جائیں یقیناً اس کی پیدائش کے وقت کواکب میں اجتماع سعادت ہوگا" (صفحہ ۷۷)

اور بخت کی تشریح اس طرح فرمائی ہے:- "بخت کی تحقیق یہ ہے کہ نفوس انسانیہ میں ایک نقطہ ہے کہ تمام نفوس اس کی طرف کھنچتے ہیں پھر وہ غالب آجاتا ہے اور نفوس اس کی طرف اس طرح آجاتے ہیں جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، پھر اگر وہ توجہ السعادت ہے تو ان نفوس میں جو اس کے آس پاس ہیں فیض پہونچاتا ہے اور اگر شقاوت میں قوی ہے تو آس پاس کے نفوس میں سختی پیدا کرتا ہے" (صفحہ ۵)

"ہمنے کئی بار مشاہدہ کیا ہے کہ بعض آدمیوں کے نفس میں ایک نقطہ ہے روشن ستارہ کی طرح چمکتا ہوا کہ اس میں سے شعاعی خطوط نکلتے ہیں اور دوسرے نفوس میں نفوذ کرتے ہیں" (صفحہ ۵)

آج کل بھی تمام ماہر نفسیات اس مسئلہ کی تصدیق کر چکے ہیں چنانچہ موسیو لیبان نے "روح الاجتماع" میں اس کی نہایت واضح تشریح کی ہے اور تمام بڑے بڑے لیڈروں میں اس قوت کا وجود ثابت کیا ہے،

شاہ صاحب لکھتے ہیں "رسول اکرم کی پیدائش احسن تقویم پر تھی یعنی بہت معتدل مزاج میں جبکہ قوی کواکب بہت اچھی صورت میں مجتمع تھے، بزرگی اور غلبہ کے مستدعی تھے (صفحہ ۷۶)

"لہذا آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ خیر وشر اور اخلاق کریمہ و ذمیمہ کا انحصار تزکیہ نفس پر ہے اگر قلب منجلی ہے تو اچھے اخلاق ہوں گے اور تاریک ہے تو بُرے حالات، اور یہ تمام علم آئینۂ نفس میں غور کرنے سے پیدا ہوئے خواہ وجدانی طور پر خواہ قیاس کے لحاظ سے" (صفحہ ۲۲)

اسی نفوذ و نفوس کے مسئلہ میں شاہ صاحب نے ابراہیم علیہ السلام کو مکارم اخلاق میں تمام انبیاء سے بہتر شمار کیا ہے، لکھتے ہیں:۔ "افعال عبادت میں ابراہیم علیہ السلام بہت پورے تھے، اس خلق میں اول درجہ کا کوئی نہ ان سے پہلے ہوا نہ ان کے بعد ہوا اسی وجہ سے خدائے تعالیٰ نے ان کو امام کیا اور انبیا کو ان کے دین کی پیروی کرنے کا حکم فرمایا" (صفحہ ۱۹)

اس کے علاوہ شاہ صاحب نے چند اور مسئلے بھی عقل کی ترازو میں تولے ہیں اور یہ ثبوت بہم پہونچایا ہے کہ کوئی امر خلاف فطرت اور خلاف عقل نہیں ہے، اور حقیقت میں یہی اسلام کا دعویٰ بھی ہے وہ خود کو ایک طلسم اور ایک مبہم چیز بنا کر پیش نہیں کرتا۔

عبیداللہ قدسی

جنوری ۳۶ء کے نگار میں کیا ہے

ہندی شاعری کی بے مثل تاریخ

ہندی کلام کا بے نظیر انتخاب

اساتذۂ فن کے دلچسپ حالات

برج بھاشا کے نوادر پر فاضلانہ نقد و تبصرہ

اور

ہندوستان کی گویوں کی شاعری

قیمت فی پرچہ دو روپیہ ـــ خریداران نگار سے کچھ نہیں

منیجر نگار

انتخاب

(تمثیلچہ)

افراد :-

دُردانہ	بہارستان کی ملکہ
ثاقب	ملکہ کا محبوب مطرب
ارژنگ	وزیر

منظر :- (صبح کو دُردانہ اپنی خوابگاہ میں حریری بستر پر نیم دراز ہے، اچاٹ نگاہیں کہ رہی ہیں کہ رات بہت بے آرامی سے بسر ہوئی ہے۔ سامنے صندلی تپائی پر زرکار رباب رکھا ہوا ہے۔

دُردانہ دیر تک ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہتی ہے، تھوڑی دیر بعد لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ بڑھا کر رباب کے تاروں کو چھیڑتی ہے، جب آواز گونجتی ہے تو رباب سے ہاتھ ہٹا کر کچھ سوچنے لگتی ہے اور پھر رباب کو دور پھینک کر دفعتہً اُٹھ بیٹھتی ہے اور ہاتھ پر سر رکھ کر سوچنے لگتی ہے)

دُردانہ :- (آہستہ آہستہ) کیا کروں، سمجھ میں نہیں آتا، کہتے ہیں محبت عورت کی زندگی ہے، لیکن فریضۂ زندگی تو نہیں ہے کہ تمام عالم کو حلقہ بگوش دیکھنا میرا مقصد حیات تھا، آج خود غلام ہوں، غلام ہوں ایک مُطرب کی، ایک ایسے شخص کی جو سب سے پہلے فریضۂ زندگی کا احساس چھینتا ہے اور پھر زندگی بخشتا ہے ـــ پھر اگر یہ زندگی صرف میری ہی زندگی ہوتی تو مجھے اختیار تھا خواہ سنوارتی یا برباد کر دیتی، لیکن میں اور میری حیات ملک و قوم کی ملکیت ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ آج سے ثاقب کے قدم محل میں آئیں۔ (بلند آواز سے) ۔ بیشک نہیں آئیں گے۔

(دُردانہ اُٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد دور سے گانے کی آواز آتی ہے وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو جاتی ہے، پھر سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور کہتی ہے)

ـــ ظالم پھر مجھے تباہ کرنے کے لئے آ رہا ہے اُس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ملیں گی اور میں پھر سر جھکا کر رہ جاؤنگی۔ (دفعتہً کھڑی ہو کر) مگر نہیں میں عزم کر چکی ہوں، ایک شاہانہ عزم اور اب وہی ہوگا جو ہونا چاہئے۔

(ثاقب ایک خوش رو نوجوان داخل ہوتا ہے اور زمین پر ٹوٹے ہوئے رباب کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے)

ثاقب :۔ (ملکہ کے سامنے جُھک کر) ملکۂ عالم، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ رباب کو کس قصور میں پامال کیا گیا ہے۔

دردانہ :۔ (منہ پھیر کر) ثاقب، جاؤ چلے جاؤ اور میری سلطنت کی حدود سے اتنی دور چلے جاؤ کہ اگر میں تمھیں ڈھونڈھوں بھی تو کبھی نہ پاسکوں۔

ثاقب :۔ ملکۂ عالم میں کچھ نہیں سمجھا کیا ارشاد ہوا۔

دُردانہ :۔ جو بات میں خود نہیں سمجھ سکتی اس کو تمھیں کیا سمجھاسکوں گی۔ مگر جو میں کہتی ہوں اس کی تعمیل تم کو کرنا چاہئے کیونکہ تمھارا وجود تمھارے لئے خطرناک ہے اور ملک تمھارا جانی دشمن ہے۔

ثاقب :۔ مگر، میرا قصور؟

دُردانہ :۔ اس کا حال اپنی نگاہوں سے پوچھو، اپنے نغموں سے دریافت کرو، جنھوں نے مجھے فرائض سلطنت سے غافل کر رکھا ہے اور جن کی موجودگی میں میں کچھ نہیں کرسکتی۔

ثاقب :۔ ملکۂ عالم، اگر میں اپنی آنکھیں پھوڑ کر اور زبان کاٹ کر آپ کو فرائض سلطنت ادا کرنے کی طرف مایل کرسکتا ہوں تو میں اس کے لئے طیار ہوں، لیکن خدا کے لئے اس فضا سے مجھے دور نہ کیا جائے جہاں دُردانہ سانس لیتی ہے۔

دردانہ :۔ (جھنجھلاکر) ثاقب، خدا کے لئے، خاموش رہو، میں ڈر رہی ہوں کہ مبادا میری نسائیت پھر مجھے مغلوب کرلے۔

ثاقب :۔ تو کیا ملکہ اپنی نسائیت سے بھی دست بردار ہوجانا چاہتی ہے۔

دردانہ :۔ ہاں، جب ثاقب نہ ہوگا تو دُردانہ صرف ملکہ ہوکر جیئے گی اور اپنی نسائیت کو بھلا دے گی۔

ثاقب :۔ کاش میں ان الفاظ کو سمجھ سکتا۔

دردانہ :۔ کاش اس ملک کے بسنے والے ایک عورت کے جذبات کو سمجھ سکتے۔ ثاقب، جاؤ، تمھارے سامنے میرے حوصلے پست ہوئے جاتے ہیں، خدا کے لئے جاؤ اور مجھے برباد نہ کرو۔

(ملکہ کی آنکھ سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں اور وہ تکیوں میں منہ چھپالیتی ہے)

ثاقب :۔ دُردانہ مجھے اس ملک کی رعایا کے ہاتھ سے قتل ہوجانا منظور ہے لیکن تجھے چھوڑنا منظور نہیں۔

دُردانہ :۔ ثاقب، مجھ پر رحم کر اور چلا جا، تجھے نہیں معلوم کہ تیرے الفاظ میرے عزائم کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔

ثاقب :۔ موت کے سوا کوئی طاقت مجھے یہاں سے نہیں ہٹا سکتی۔

دردانہ :۔ لیکن تجھے معلوم ہے کہ اس موت کے کیا معنی ہیں۔

ثاقب :۔ دائمی سکون۔

دردانہ :۔ نہیں، دُردانہ کی موت۔

ثاقب :۔ (گھبراکر) موت! دُردانہ کی موت! نہیں میں کبھی اسے گوارا نہیں کر سکتا اور میں اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہوں۔

(یہ کہکر وہ واپس جاتا ہے اور دروازہ تک پہونچتا ہے)

دردانہ :۔ (گھبراکر) ثاقب، ٹھہر جا، میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔

(وزیر ارژنگ داخل ہوتا ہے)

ارژنگ :۔ مجلس شوریٰ ملکۂ عالم کا فیصلہ سننے کی منتظر ہے۔

دردانہ :۔ جاؤ ان سے کہدو کہ تمہاری ملکہ نے سلطنت اور ثاقب میں صرف ثاقب پسند کیا ہے۔

(وزیر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ملکہ ایک ہاتھ کے اشارہ سے اسے منع کرتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے ثاقب کا دامن پکڑ لیتی ہے۔)

دُردانہ :۔ ثاقب، رباب اُٹھاؤ اور چلو، اب تمہارا دل میری مملکت ہوگی اور اس کے امن و سکون کا قیام میرا فرض۔

(دونوں محل کے دروازہ سے باہر نکل جاتے ہیں اور ارژنگ دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے)

سروپ رانی نگار

جمالستان

حضرت نیاز کے اُن ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ جو انشاء عالیہ کی جان ہیں۔
ادب اُردو میں جو خصوصیت حضرت نیاز کی طرز نگارش کو حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔
اس ۵۷۵ صفحات کے مجموعہ کا ہر ہر لفظ اپنی جگہ ایک ایسی دلکش حقیقت کا مالک ہے جو صرف مطالعہ کے بعد ہی واضح ہو سکتی ہے۔
قیمت فی جلد خریداران نگار سے تین روپیہ اور غیر خریداران نگار سے چار روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

زلزلہ اور بداعمالی

(جناب فضل الدین احمد صاحب ۔ فورٹ سنڈیمن)

عام لوگوں کا خیال بلکہ یقین ہے۔ کہ کوئٹہ میں جو زلزلہ گزشتہ ماہ میں آیا ہے۔ وہ اہل کوئٹہ کی بداعمالیوں کی وجہ سے آیا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف کی ان آیات سے بھی تصدیق ہوتی ہے:۔

"اذا اردنا ان نہلک قریۃ امرنا مترفیہا ففسقوا فیہا فحق علیہا القول فدمرنٰہا تدمیراً ؁ وکم اہلکنا من قریۃ بطرت معیشتہا فتلک مسٰکنہم لم تسکن من بعدہم الا قلیلا وکنا نحن الوارثین ؁"

لیکن سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا کوئٹے میں دیگر بڑے بڑے مقامات سے زیادہ بداعمالی تھی؟ جو قدرت کو وہاں غضب سے کام لینا پڑا۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ اور میں نے بچشم خود دیکھا ہے۔ پنجاب ہندوستان اور دیگر ممالک میں کوئٹے سے کہیں زیادہ بداعمالیاں ہوتی ہیں۔ اور وہ کونسا طبقہ ہے جہاں نیک و بد لوگ نہیں رہتے ہیں۔ اسی طرح کوئٹے میں بھی اگر سیکڑوں بدکار تھے۔ تو ہزاروں کی تعداد میں نیکوکار لوگ بھی تھے۔ اگر مسلمان زیادہ تھے۔ تو غیر مسلم عیسائی۔ ہندو۔ پارسی وغیرہ بھی کم نہ تھے۔ زلزلہ ایک اتفاقیہ امر ہے۔ جس کا غضب سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ مگر اکثر مسلمان میرے اس خیال سے متفق نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ غیر مسلم اقوام کو خداوند کریم نے قیامت تک کی مہلت دیدی ہے۔ اُن سے ان کے اعمال کا دنیا میں کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ اسی لئے ان ممالک (جاپان کے زلزلہ کا ثبوت ان کو مطمئن نہ کر سکا) میں زلزلہ نہیں آتا۔ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ تو کیا لاہور۔ دہلی۔ کلکتہ۔ بمبئی وغیرہ شہروں میں مسلمان آباد نہیں ہیں؟۔ اور وہاں کی بیشتر مسلم آبادی بداعمال نہیں ہے؟۔ تو پھر وہاں خداوند کریم نے اپنا غضب نازل کیوں نہ کیا؟۔ اور اگر کوئٹہ پہ ہوا۔ تو کیوں غیر مسلم برابر بلکہ زیادہ تعداد میں ہلاک ہوئے؟۔

میں امید کرتا ہوں۔ کہ جناب "نگار" کے صفحات پر اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے اور یہ بھی بتلائیں گے۔ کہ عہد حاضرہ کی عالمگیر تباہی جو زلزلہ۔ آتش۔ سیلاب۔ طوفان آندھی کی صورت میں دنیا کے تمام حصوں میں رونما ہے۔ کیا معنی رکھتی ہے؟

(نگار) اس سے قبل جب صوبۂ بہار میں زلزلہ آیا تھا، اس وقت بھی عوام نے یہی خیال کیا تھا کہ یہ سزا ہے انسانی بداعمالیوں کی اور اب کوئٹہ کے متعلق بھی لوگوں کا یہی خیال ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بہار اور کوئٹہ کے زلزلوں سے پہلے جب کبھی دنیا میں زلزلہ یا کوئی اور ایسا ہی سخت حادثۂ طبیعی ظہور میں آیا جس کا سبب عوام نہیں سمجھ سکتے تھے، ہمیشہ اس کو عذاب خداوندی سمجھا گیا اور چونکہ خدا کا عذاب صرف بدکار انسانوں ہی کیلئے مخصوص ہے اس لئے اس کا کھلا ہوا منطقی نتیجہ یہی نکلا کہ جب کبھی زلزلہ آتا ہے وہ نتیجہ ہوتا ہے انسان کی بدکاریوں کا اور اہل مذہب کی طرف سے اس کا ثبوت بھی آسمانی کتابوں سے پیش کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ آپ نے سورۂ بنی اسرائیل کی دو آیتوں سے استدلال کیا ہے۔

ان آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ "جب ہم کسی بستی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو ہم وہاں کے خوشباش لوگوں کی ہدایت کے لئے احکام نازل کرتے ہیں اور جب وہ اُن احکام سے سرتابی کرتے ہیں تو ہم اس بستی کو بالکل تباہ کر دیتے ہیں۔ اور نوح کے بعد ہم بہت سی نسلوں کو اسی طرح برباد کر چکے ہیں اور اللہ اپنے بندوں کے گناہوں سے پورا خبردار رہتا ہے"۔

ان آیتوں میں چونکہ بستیوں کی بربادی کا سبب انسانی عدوان و بغاوت کو قرار دیا گیا ہے اور بستیوں کی ویرانی کا بڑا ذریعہ زلزلہ ہوا کرتا ہے، اس لئے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ملک کے جن حصوں میں زلزلے آتے ہیں وہ انسانی بدکاریوں کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے اور نہ قرآن پاک کی ان آیتوں سے یہ استدلال درست۔

سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ خدا کا یہ ارشاد کہ "اذا اردنا ان نہلک قریۃ" سے کیا مراد ہے۔ یعنی خدا کا کسی بستی کی بربادی کا ارادہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر اس کا مفہوم یہ قرار دیا جائے کہ خدا خود بربادی چاہتا ہے اور لوگوں کی عصیانکاری کا بہانہ ڈھونڈھتا ہے تو یہ نہ صرف صفات خداوندی کے خلاف ہوگا بلکہ دیگر آیات قرآنی کے بھی منافی ہوگا۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:۔ "ان اللہ لایامر بالفحشاء" (اللہ کسی کو بُرے کام کرنے کا حکم نہیں دیتا) اور خود آپ کی پیش کردہ آیات سے قبل جو آیت نظر آتی ہے اس سے بھی اس خیال کی تردید ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔ "من اہتدیٰ فانما یہتدی لنفسہ ومن ضل فانما یضل علیہا"

یعنی جو سیدھی راہ اختیار کرتا ہے وہ اسی کے فائدہ کے لئے اور جو غلط راہ چلتا ہے اس میں اسی کا نقصان ہے اس آیت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کسی کو گمراہی پر مجبور نہیں کرتا۔ الغرض یہ خیال کرنا کہ خدا خود کسی قوم کو گمراہ کرنے اور پھر بستی کی بستی کو اُلٹ دینے کا ارادہ کرتا ہے، سخت لایعنی بات ہے اور خدا کا جو مفہوم مذہب نے بتایا ہے اس کے بالکل منافی ہے۔

فی الحقیقت یہ قرآن کا انداز بیان ہے اور عربوں کے نمونۂ خطابت میں بھی اس قسم کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

اب رہگیا بستی کو تباہ کرنے کا مفہوم سو یقیناً اس سے مراد در و دیوار کی مسماری نہیں ہے بلکہ اہل قریہ کی تباہی مراد ہے اور ظاہر ہے کہ جب کسی بستی کے رہنے والے برباد ہو جائیں گے تو وہ بستی آپ اُجاڑ نظر آئیگی۔

اس لئے ان آیات کا صحیح مفہوم یہ ہوا کہ جب کوئی قوم بداعمالی کرتی ہے تو وہ برباد ہو جاتی ہے، لیکن بداعمالی سے مراد ترک صوم و صلوٰۃ نہیں بلکہ احساس قومیت و خودداری کا فقدان، قوائے عمل کا اضمحلال، غلامانہ ذہنیت کا استیلاء، اور جمود و تعطل ہے، جو آجکل ہندوستان کے مسلمانوں پر طاری ہے اور جس کا یقینی نتیجہ اس قوم کی عام بربادی اُن کی بستیوں کی ویرانی ہے، اور جو نتائج زلزلہ سے کہیں زیادہ عبرت خیز و حسرتناک ثابت ہونے والی ہے۔

زلزلہ بھی منجملہ دیگر طبیعی حوادث کے ہے جس کے اسباب متعین ہو چکے ہیں اور اس کو انسانی بداعمالیوں سے کوئی تعلق نہیں، یہاں تک کہ اگر بہار و کوئٹہ میں سوائے اولیاء کرام کے کوئی اور متنفس نہ پایا جاتا تو بھی زلزلہ کی تباہکاریاں اسی طرح ظاہر ہوتیں اور اگر ریگستانی مقامات میں رات دن سوائے فسق و فجور کے اور کچھ نہ ہو تو وہاں زلزلے کے شداید کبھی محسوس نہیں ہو سکتے۔

اس نوع کا استدلال صرف اس ملایانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے جسے عقل سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے اور جس نے مذہبی لٹریچر کو بھی اپنی احمقانہ تاویلوں سے گندہ کر کے ہمیشہ دوسروں کو ہنسنے کا موقع دیا ہے۔

حجر اسود۔ تخلیق عالم چھ دن میں

(جناب محفوظ الرحمٰن صاحب۔ جھالاواڑ)

کرامت ظہور حضرت مولانا نیاز صاحب۔ ہدیہ سلام مسنون۔ چونکہ فی زماننا آپ کے فیض تحقیق و

تدقیق سے وسیع النظر و صحیح دماغ روشن اور منور ہو رہے ہیں لہٰذا یہ نیاز مند بھی بہ وکالت نیاز نامہ ہذا نیاز مندانہ حضرت نیاز میں بہ اُمید عطائے جواب سوال ذیل غائبانہ شرف نیاز حاصل کرتا ہو۔ وھوہٰذا

(۱) حجر اسود موجودہ خانۂ کعبہ کے نسبت مختلف اقوال پڑھنے اور سننے میں آتے ہیں مورخ تو کہتے ہیں کہ یہ ایک سیارہ تھا جو ساتویں صدی عیسوی میں بصورت شہاب ثاقب معمولاً آسمان سے ریگستان عرب میں گرا جس کو اہل عرب مکہ میں لے گئے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ پہلے سے اسکو حضرت ابراہیمؑ نے خانۂ کعبہ میں بروقت بناء کعبہ میں نصب کیا تھا چونکہ اس کا وجود ارکان حج فریضہ میں داخل ہے لہٰذا مطلع فرمایئے کہ اس کی صحیح اصلیت کیا ہے اور در اصل یہ پتھر ہے یا کوئی دہاتی شے۔ اور یہ خانۂ کعبہ میں کب اور کیونکر اور کہاں سے آیا اور اس کے بصورت بوسہ دینے کے ارکان حج میں داخل ہونے کی کیا حقیقت ہے۔

(۲) اللہ تعالےٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے کہ۔ "وہ خلق السموات والارض فی ستۃ ایام ثم استویٰ علی العرش"۔ اور یہ بھی ارشاد ہے کہ:۔ "قال کذالک یخلق اللہ من یشاء اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہٗ کن فیکون"۔ پس استدعا دریافت یہ ہے کہ آیہ کن فیکون کے مقابلہ میں زمین و آسمان کا مخصوص چھ روز میں بننا ظاہر کرنے میں معیناً یا تاویلاً کیا مصلحت ہے اور کیا آسمان کوئی مرکب یا مادی شے ہے کہ جس کی ترکیب و صنعت میں اُس کن فیکون جیسی قادر و ناتعد ولاتحصےٰ طاقت کو بظاہر چھ روز صرف کرنا پڑے اور کیا یہ آسمان بہ درجہ کئی آسمان ہیں جیسا کہ علماء و مفسرین کا بیان ہے۔

میں نے بہ نظر تحقیق آپ کے تحقیقی معیار کے مطابق یہ مسایل حل کرنا مناسب سمجھ کر تکلیف دی ہے امید کہ نگار کے قریبی اشاعت میں اس کا جواب مفصل شائع فرمائیں گے۔

(نگار) (۱) حجر اسود کے متعلق اس سے قبل کئی سال ہوئے میں اظہار خیال کر چکا ہوں، اگر آپ اس کو دیکھنا چاہتے ہیں تو مجموعۂ استفسار و جواب جلد اول ملاحظہ فرمایئے۔

(۲) جو آیت چھ دن میں آسمان و زمین کے پیدا کرنے کی آپ نے پیش کی ہے، وہ بڑی مابہ النزاع چیز ہے اور مختلف مفسرین نے مختلف مفہوم ظاہر کیا ہے۔ بعض نے یَوم سے دور مراد لیا ہے اور ہر دور پچاس پچاس ہزار سال کا قرار دیا ہے، بعض نے ایک دن ہزار سال کا بتایا ہے، بعض نے یَوم سے حالت مراد لی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ سب بارد تاویلیں ہیں اور عقل سے دور۔

حقیقت یہ ہے کہ آسمان و زمین کے چھ دن میں بنائے جانے کا اعتقاد اسلام کی اختراع نہیں ہے

بلکہ یہود کا اعتقاد ہے اور توریت میں اس کا ذکر موجود ہے۔ چونکہ اہل عرب بھی یہود کی روایات کو صحیح تسلیم کرتے تھے اس لئے انھیں کے عقیدہ کو اُن کے سامنے پیش کرکے خدا کی عظمت ظاہر کی گئی ہے، چنانچہ تفسیر کبیر میں اس کی صراحت موجود ہے اور میرے نزدیک یہی بہترین تاویل ہے۔ صاحب تفسیر کبیر لکھتے ہیں کہ:-

"توریت میں لکھا ہے کہ خدا نے چھ دن میں آسمان و زمین پیدا کئے، پھر چونکہ اہل عرب کا یہودیوں سے بہت خلط ملط تھا اور انھوں نے یہود سے یہ بات سُنی تھی، اس لئے خدا فرماتا ہے کہ تم بتوں کی پرستش نہ کرو کیونکہ تمھارا پروردگار تمھارے ہی عقیدہ کے مطابق اتنا عظمت والا ہے کہ چھ دن میں اس نے آسمان و زمین پیدا کئے۔"

(۳) "کن فیکون" کے جو معنے عام طور پر سمجھے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں، یعنی اس کا مفہوم یہ قرار دینا کہ لفظ کُن کہا گیا اور کائنات فوراً ظاہر ہوگئی غلط ہے۔

فیکون میں حرف (ف) تدریج و ترتیب کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی جب خدا کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے ظہور کا حکم دیتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ تدریج کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے، علاوہ اس کے کُن فیکون کہکر یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ خدا آفرینش کے لئے کسی نمونہ کا محتاج نہیں ہے اور نہ وہ مادی ذرایع کا پابند ہے۔

یادگار - ادبائے ہند کا بے مثل مرقع

جناب وصل بلگرامی ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ حال ہی میں ان سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک نہایت ہی اہم اور دلچسپ کام میں عرصہ سے مصروف ہیں۔ یعنی وہ ایک ایسا مرقع طیار کر رہے ہیں جس میں ملک کے تمام ادبائے ماضی و حال کی تصاویر معہ اُن کے نمونۂ تحریر اور مختصر حالات کے یکجا نظر آئیں۔ اس سلسلہ میں اسوقت تک جتنا کام ہوا ہے وہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور بہت کافی ہے۔

لیکن یہ کام اتنا اہم اور اسقدر مشکل ہے کہ تنہا ایک شخص کی کوشش اس کو کامیاب نہیں بنا سکتی بلکہ ضرورت ہے اجتماعی حیثیت سے سعی و عمل کی۔ یقیناً اسوقت ملک کے بہتیرے ادیب و مصنف شاعر و ناثر ایسے ہیں جنکی تصاویر یا تحریروں کے نمونے وہ ابتک فراہم نہیں کر سکے ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تمام ایسے حضرات جو اس مرقع میں شرکت کرنا چاہتے ہیں اپنی تصاویر کے بلاک معہ نمونۂ تحریر و مختصر حالات کے جناب وصل کے پاس بھیجدیں۔ اور اس باب میں تنہا وہی نہیں بلکہ میں بھی ممنون ہوں گا۔ ان کا پتہ ——— قیصر باغ لکھنؤ کافی ہے۔

کارامروز نمبر کے تنقیدی حصہ پر ایک غیر جانبدارانہ تبصرہ

جناب سیماب اکبرآبادی کا مجموعۂ منظومات (کارامروز) چھپکر طیار ہی ہوا تھا کہ جناب سیماب نے ۲۲ دسمبر ۳۳ء کو مجھے ایک خط لکھا جو بعینہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:-

محترمی - السلام علیکم - میری نظموں کا جدید مجموعہ "کارامروز" چھپ کر طیار ہو چکا ہے - میرا ارادہ نہ تھا کہ میں اس مجموعہ کے لئے مقدمہ لکھواؤں مگر بعض احباب اور تلامذہ کا اصرار ہے کہ مقدمہ ضرور لکھوایا جائے - میری نظموں پر مقدمہ لکھنے والے میں چند اوصاف کا ہونا ضروری ہے -

(۱) وہ میرے یقین میں میرا معاصر ہو (۲) ادبیات مشرق و مغرب پر اسے عبور ہو (۳) اسکا دماغ قدامت زدہ نہ ہو -

آپ میں یہ تمام اوصاف موجود ہیں، اس لئے بغیر کسی تکلف و تصنع کے آپ کو دیباچہ نگاری کی تکلیف دینا چاہتا ہوں - مقدمہ کی جلد ضرورت ہے، کتاب طیار ہو چکی ہے - مقدمہ کی کتابت و طباعت کے بعد شائع ہو جائے گی - اجازت دیجئے کہ کارامروز کے مسودات ذریعہ رجسٹری آپ کو بھیجدوں یا خود لیکر چلا آؤں -

مولانا، نہ انکسار کی ضرورت ہے نہ اعتذار کی، آپ مجھے جانتے ہیں اور میں آپ کو - مقدمہ لکھ ہی دیجئے - اپنے صوبہ میں آپ سے بہتر مجھے کوئی اور شخص اس کام کے لئے نظر نہیں آتا -

منتظر جواب

سیماب اکبرآبادی

میں نے اس کے جواب میں اپنی غیر معمولی مصروفیت کا عذر پیش کیا، لیکن انھوں نے پھر اصرار فرمایا اور میں نے لکھدیا کہ مسودہ بھیجدیجئے -

جس وقت مسودہ آیا اور میں نے جستہ جستہ اس کا مطالعہ کیا تو میں نے یہ دیکھکر کہ وہ اغلاط سے پاک نہیں ہے یہی مناسب سمجھا کہ مقدمہ لکھنے سے احتراز کیا جائے اور آخر کار میں نے مسودہ واپس کر دیا -

اس کے بعد جب کتاب چھپ کر ریویو کے لئے موصول ہوئی تو اس وقت بھی میں نے خاموشی اختیار کی لیکن جناب سیاب کے متواتر دیہم اصرار سے مجبور ہو کر میں نے ریویو کیا اور محاسن کے ساتھ جو نقایص نظر آئے وہ بھی ظاہر کر دئے۔ جس وقت ریویو کی پہلی قسط اپریل ۳۵ء کے نگار میں شایع ہوئی تو میں متامل تھا کہ آیندہ اس سلسلہ کو جاری رکھوں یا نہیں لیکن سیاب صاحب کا ایک کارڈ ملا جس میں تحریر تھا کہ :-

"کارامروز پر مفصل تبصرے کا شکریہ - براہ کرم اس کا حصۂ باقی بھی آیندہ نمبر میں ضرور شائع کردیجئے تاکہ میں آپ کی رائے اور آپ کے خیال سے کلیتاً مستفیض ہوسکوں"

چنانچہ باقی دو حصے اس ریویو کے مئی اور جون کے نگار میں شایع کرکے میں خاموش ہوگیا۔ اس کے کئی مہینے کے بعد رسالہ "شاعر" (آگرہ) میں کارامروز نمبر کا اعلان دیکھا اور اسی میں کسی جگہ اس مفہوم کا بھی اعلان تھا کہ اس خاص نمبر میں نیاز کی اس "یتیم العلمی" اور ناابلی کو بھی ظاہر کیا جائے گا جو کارامروز کے سلسلۂ تبصرہ میں اس سے ظاہر ہوئی ہے۔

آخر کار بڑے انتظار کے بعد جولائی کا شاعر (جو کارامروز نمبر کے نام سے موسوم ہے) ستمبر میں موصول ہوا اور جناب فضل الدین اثر کا وہ مضمون پڑھا جس میں انھوں نے میرے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

خیر اعتراضات کا جواب تو ایسی بات نہیں ہے جس کی طرف مجھے توجہ ہوتی، لیکن تحریر کے انداز بیان نے مجھے بہت لطف دیا اور میں حیران رہ گیا کہ اثر صاحب کو میری سیرت و خصوصیات کا اتنا صحیح علم کیونکر حاصل ہوسکا۔ ہرچند میری سمجھ میں اسوقت تک یہ بات نہیں آئی کہ میرے تبصرہ کا جواب دینے کے لئے میرے اخلاق و عادات سے بحث کرنے کی کیا ضرورت تھی تاہم چونکہ اثر صاحب نے کافی وسعت نظر سے کام لے کر اس خدمت کو انجام دیا ہے اس لئے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

سب سے پہلے انھوں نے مجھے "جاہل حاسد" کے لقب سے یاد کیا ہے اور پھر بہ تصدیق و روایت جناب جوش ملیح آبادی "فریب خوردہ انسان" کا خطاب مرحمت فرمایا ہے، اس کے بعد کسی جگہ انھوں نے میری بصارت کے فقدان پر ماتم کیا ہے، کہیں میرے ملحدانہ کفر کا ذکر فرمایا ہے اور اس پیشین گوئی کے ساتھ کہ "وہ وقت بہت قریب ہی جب مولانا نیاز فتحپوری نہ کوؤں میں رہیں گے نہ موروں میں"۔ پھر یہ خطابات تو وہ ہیں جو یونہی گرمی سخن قائم رکھنے کے لئے استعمال کئے ہیں ورنہ جواب کے سلسلہ میں تو انھوں نے اس سے بھی زیادہ حسن مراعات سے کام لیا ہے۔

میں کبھی اس نوع کی تحریروں پر اعتناء کرنے کا عادی نہیں ہوں اور چونکہ جناب اثر کے کسی لفظ سے مجھکو کسی قسم کی کوئی تکلیف ہی نہیں پہونچی اس لئے یوں بھی مجھے جواب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اتفاق سے ایک اور

صاحب کا مضمون اس موضوع پر آگیا اور میں نے اسے صرف اس لئے شائع کرنا مناسب سمجھا کہ اس کے سلسلہ میں مجھے بھی چند باتیں کہنے کا موقع مل جائے گا اور اثر صاحب اس صدمہ سے محفوظ رہیں گے کہ میں نے اس کا کوئی اثر ہی نہیں لیا۔

رسالۂ شاعر کی اس اشاعت میں جو کارامروز نمبر سے موسوم ہے، تمام رائیں اور تبصرے نقل کئے گئے ہیں لیکن نگار کا تبصرہ شائع نہیں کیا گیا کیونکہ نگار کے پرچے اثر صاحب مسوری لیکر چلے گئے تھے اور جب وہ واپس آئے تو رسالہ میں جگہ باقی نہ رہی تھی۔ ممکن ہے یہ عذر صحیح ہو، لیکن مجھے نہیں کسی شخص کو یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ نگار کا مفصل تبصرہ لفظ بہ لفظ نقل کرنے کے بعد جواب دینا مشکل ہو جاتا، کیونکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نگار کے تقریباً سوا سو اعتراضوں میں سے صرف ۲۹ اعتراضوں کا ذکر کیا گیا ہے اور باقی کی طرف سے بالکل خاموشی اختیار کی گئی ہے۔

اسی سلسلہ میں مجھے یہ بھی ظاہر کر دینا چاہئے کہ لفظ حسین کے متعلق لطیف صاحب کی جس تحریر کا ذکر کیا گیا ہے وہ میری نظر سے گزر چکی ہے، لیکن لطیف صاحب کو نہیں تو کم از کم سیماب صاحب کو اور ان کی وساطت سے آپ کو ضرور معلوم ہونا چاہئے کہ فارسی زبان یا فارسی انشاء کے باب میں مولانا روم کی مثنوی بالکل ساقط الاعتبار چیز ہے اس کے مرتبہ کی بلندی کا تعلق صرف اس کے مفہوم و مطالب سے ہے، الفاظ یا زبان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لئے اگر علاوہ مثنوی کے کسی اہل ایران کے کلام میں لفظ حسین کا استعمال ہوا ہو تو اس کے سننے کا میں بھی مشتاق ہوں۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ مثنوی کے قدیم نسخوں میں حسینانِ زمن نہیں ہے بلکہ جمیلانِ زمن ہے۔ خیر ان کے اس قول کو تو میں سند اً پیش نہیں کرتا لیکن یہ ضرور عرض کرونگا کہ فارسی زبان کی بحث میں آئندہ اگر مولانا روم کی مثنوی سے استناد کی مضحکہ خیز جرأت نہ کیجائے تو مناسب ہے۔

نیاز

انسانی زندگی کے تمام واقعات اکثر و بیشتر نتیجہ ہوتے ہیں جذباتی رجحانات کا۔ ماہرینِ علم النفس اس پر متفق ہیں کہ انسانی جذبات میں جذبۂ محبت اور جذبۂ غیظ و غضب کا غلبہ دماغی توازن کو برباد کر دیتا ہے چنانچہ یہ مسلم ہے کہ ایک فنافی المحبت یا مغلوب الغضب کبھی کسی صحیح رائے کا اظہار نہیں کر سکتا۔

ابتک کارامروز پر جتنے تبصرے ہوئے ہیں اُن میں سوائے مولانا نیاز فتحپوری کے تمام تر مبصرین سیماب اور سیمابیت کے دلدادہ ہیں اور اُن کا حسنِ اعتقاد اس بات کی اجازت نہ دے سکا کہ وہ تنقید و تبصرہ کو ٹھنڈے دل سے ادبی کسوٹی پر کستے۔ تبصرہ نیاز سے اس بات کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک مبصر کو کتنا دیانتدار ہونا چاہئے۔ تبصرہ چونکہ کسی امر کے کلی و جزئی محاسن و معائب پر ایک غائر نظر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار ہو۔

قریب قریب نیاز صاحب اس معیار سے کہیں نہیں ہٹے۔

فضل الدین صاحب اثر سیمابی ہیں۔ سیمابیت کے دلدادہ ہیں۔ انھیں تمام اقصائے عالم میں صرف سیماب صاحب ہی کی ایک ایسی ہستی نظر آتی ہے جو ان کے "ادبی جذبۂ اعتقاد" کی مرکز ہے۔ اس لئے تنقید نیاز پر اُن کی برہمی و بیقراری قطعاً حق بجانب ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کا یہ حُسنِ اعتقاد سیمابیت کے تاریک ترین پہلوؤں پر کبھی نظر نہ کرنے دے۔ نیز ہر وہ بات جو سیماب صاحب کے خلاف ہو (چاہے قطعاً درست ہی کیوں نہ ہو) "مجروحِ عقیدت" دل پر تیر و نشتر ثابت ہوگی، لیکن اس میں نیاز صاحب کا کیا قصور؟ نیاز صاحب نے بالکل وہی کیا جو ایک دیانتدار مبصر کا فرض ہوتا ہے جس کے روشن دلائل اُن کے "اعترافاتِ محاسن" اور "اعتراضاتِ معائب" ہیں۔

سیماب صاحب فرشتہ نہیں بشر ہیں اور بمقتضائے بشریت غلطی بھی کر سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اثر صاحب کی عقیدتمندانہ نگاہیں اُن پر نہ پڑیں۔ تاہم ماہرینِ فن کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام مطبوعات کی فنی اور ادبی خصوصیات کو روشنی میں لاکر دنیائے ادب کی سپرد کردہ ذمہ داریوں کو ادا کریں۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز اور مضحکہ خیز یہ بات ہے کہ اثر صاحب نے جو تنقیدی معیار قائم کئے ہیں اُن پر سیمابی عقائد کی وجہ سے خود بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔ آپ کے مزعومات کے مطابق ناقد کو "گڑے مردے نہ اکھاڑنا" چاہئے۔ لیکن نیاز صاحب کی ملحدانہ زندگی کے تذکرہ سے کیا منشا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ اثر صاحب نے (جو ذہنی توازن اور شائستگیٔ خیال کو معیارِ تنقید قرار دیتے ہیں) نیاز صاحب کی پرائیوٹ زندگی بیان کرکے کیوں دل کے جلے پھپھولے پھوڑے اور خارج از بحث موضوع نظائر پیش کرکے خود کو ایک زبردست علمبردار ادب ثابت کرنے کی ناکام کوششیں کیں اور بقول خود ایک جاہل حاسد کی حیثیت اختیار کرکے ایک ناقد کے منصبِ اعلیٰ سے گر گئے۔

شاعر کی تصنیفات کو غزلوں اور نظموں کی بیاض تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ امر تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے کہ نظموں کے موضوعات اور تجزیۂ خیالات کو کیا کہا جائے جو اکثر فلسفیانہ نظائر، حکیمانہ تجاویز، مذہبی مشورے، قومی احساسات، سیاسی اسباق اور جذباتی رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں کم عقل سے کم عقل بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ شعر یا نظم جس موضوع کے ماتحت ہو اُس پر اُسی موضوع کے نظریوں سے بحث کیجائے پھر یہ کہنا کس قدر تنگ نظری اور علمی افلاس کی دلیل ہے کہ شاعر کی رائیں اتفاق و اختلاف کے لئے نہیں بلکہ محض برائے حصولِ حظ ہوتی ہیں۔ اس حیثیت سے تو شاعر ایک پیغمبرِ فطرت نہیں بلکہ محض ایک کامیڈین Commedian ہے جو بیک وقت چند تماشائیوں کی وقتی تفریح کا باعث بن سکے۔ طرفہ تماشہ یہ کہ اثر صاحب نظموں کی

بیاض کو پرائیوٹ ڈائری سے تعبیر کرتے ہیں - ان کا میدانِ صحافت میں آنا کیا معنی رکھتا ہے - خدا رحم کرے اگر یہی حال رہا تو کیا عجب کہ شاعر کی پرائیوٹ لائف بھی منظرِ عام پر رونما ہو جائے -

---

اثر صاحب فرماتے ہیں کہ شاعر نہ تو فلسفی ہے نہ مدبر نہ سیاسیات کا ماہر نہ اخلاقیات کا مدرس تو پھر شاعر کس مرض کی دوا ہے ؟ - حالانکہ مولانا سیماب فرماتے ہیں کہ :-

شاعر نہ ہو تو صورتِ ملہم فضول جائے　　شاعر نہ ہو تو دنیا نظم اپنا بھول جائے

جب جادۂ اقوام میں دشواریاں ہوں سدراہ　　اسوقت شاعر سے کہو تدبیر آسانی کرے　(سیاست)

جب گردِ فکر و یاس میں دب جائے سارا قافلہ　　اسوقت شاعر سے کہو سعی درخشانی کرے　(اخلاقیات)

جب شورشوں کے بعد بھی ممکن نہ ہو اک انقلاب　　اس وقت شاعر سے کہو خونِ جگر پانی کرے　(سیاست)

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر　　ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر　(محبت)

حدِ معلومہ ہستی سے گزرتا ہی نہیں　　صرف اک یہ ہے وہ انسان جو مرتا ہی نہیں　(مذہبیات)

مشتے نمونہ از خروارے ——— واللہ اُستاد اور شاگرد کا تضادِ خیال بہت ہی پر لطف ہے -

عرضِ حال

نہ تو میں نیازی ہوں اور نہ سیماب صاحب سے کوئی ذاتی پرخاش ہے - فن کی خدمت اور اظہارِ حقیقت کا جذبہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ نیاز صاحب کے اعتراضات اور اثر صاحب کے جوابات پر ایک خالص ادبی غیر جانبدارانہ تبصرہ پیش کروں -

اعتراض :-　وہ سطحِ زمیں پر تن تن کر حوروں کی طرح چلنے والے

اس مصرع میں سب سے پہلے اثر صاحب کو مشبہ، مشبہ بہ اور وجہ شبہ میں ایک شدید ابہام واقع ہوا ہے، حالانکہ مبتدی شعرا بھی یہ جانتے ہیں کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ شبہ ایک خاص صفت ہوتی ہے - حور چونکہ مذہبی تخئیل کی پیداوار ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی صفات کے لئے مذہبی لٹریچر سے استفادہ کیا جائے - صرف اسی خیال کے اظہار پر اثر صاحب نیاز صاحب پر بری طرح برسے اور اپنے زعمِ ہمہ دانی میں نہ جانے کیا کیا خارج از موضوع جذبات کا اظہار کیا - ایک " ذمہ دار شاعر " کم از کم اتنا فاتر العقل تو نہیں ہوتا کہ شعری مشورہ کے جواب میں ذاتیات پر ناجائز حملے بھی روا رکھے -

زندگی ہستی مرحوم پہ احساں کردے　　پھر مرتب مرے اجزائے پریشاں کردے

اعتراض یہ ہے کہ " زندگی " کو بغیر ندا کے اس جگہ استعمال کرنا مناسب نہیں - وجہ اعتراض چونکہ محلِ استعمال

ہے اس لئے ذوق سے کے شعر کو دلیلاً پیش کرنا اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ منادی بغیر ندا کے بھی استعمال ہوتا ہے ایک بے معنی بات ہے جبکہ دونوں کے محل استعمال میں دور کا بھی واسطہ نہیں ہے شاید اس مسئلہ کی وضاحت اثر صاحب کی تمہید میں کہیں نہیں ہے - کیا عجب ہے کہ جس طرح آپ اور مقامات پر اپنے نظریوں سے ہٹ چکے ہیں یہاں بھی منشا صرف معترض کو مرعوب کرنا ہو۔

شعر۔ پھر بنا لائے مجھے رنگینیٔ دامانِ بہار پھر گلستاں میں گل و لالہ بداماں کر دے

جہاں تک ادبی تعلق ہے معترض کی زریں رائے قابل قدر ہے۔ اور اثر صاحب باوجود اعتراف احتراز کے فطرت سے مجبور ہو کر یہاں بھی ذاتیات پر حملہ کناں ہیں۔ رہا اصلاح کا سوال تو۔

سونپ دے پھر مجھے رنگینیٔ دامانِ بہار پھر گلستاں میں مجھے لالہ بداماں کر دے

میں "مجھے" کی تکرار نے جو لطف بیان پیدا کر دیا ہے اس سے کچھ ارباب فصاحت ہی حظ انداز ہو سکتے ہیں نیز سونپ دے کی رکاکت بھی دلیل طلب ہے۔

شعر۔ جمع کر کے مرے سامانِ نواسنجی کو بربطِ خامشی عالمِ امکاں کر دے

اس شعر میں معترض اور مجیب کے درمیان ایک دلچسپ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ شعر محض المعنی فی بطن الشاعر کی تفسیر کر رہے ہیں۔

شعر۔ محفلِ عالم جمالِ حُسن سے خالی ہوئی صبح کی صورت جہنم کی طرح کالی ہوئی

جمالِ حُسن اور جلوہ کے امتیاز میں معترض کو ایک شدید مغالطہ ہوا۔ تاہم مشورہ نیک ہے اور محض تبادلۂ الفاظ سے معانی میں ایک شاندار اضافہ ہو جاتا ہے ۔۔۔ ثانیاً شاید سیماب صاحب جہنم اور پردۂ ظلمات کو مترادف سمجھتے ہیں۔ ایسی جگہ جہاں شعلے دہکتے ہوں "کالی" کہنا کتنی لغو اور مہمل بات ہے فاضل معترض نے نہ جانے کیوں اسے نظر انداز کر دیا۔ صبح کو جو مرکز انوار و منظہر تجلیات ہے جہنم کی طرح کالی کہنا ایسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے جسے مذہبِ فطرت کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

شعر۔ مستقل جو عہد شخصیت کا لعنت ہو گیا نام اُس قانونِ وضعی کا سیاست ہو گیا

نیاز صاحب یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ شخصیت سے (Autocracy) کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ شخصیت اور شخصی حکومت میں جو فرق ہے اس سے سوسائٹی کا ہر فرد واقف ہے۔ شعر کا مفہوم جو اثر صاحب نے پیش کیا ہے وہ صرف اُن کی ذہنی پیداوار ہے جس کا اصل شعر سے کوئی ربط نہیں۔ قانون وضعی سے محض لفظی معنی لینے کے بعد بھی صرف قانون مفاد مراد لینا (اور قانون استبداد کو نظر انداز کر دینا) ایک ایسی بدعت ہے جسے لٹریچر کبھی گوارا نہیں کر سکتا ۔۔۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ محض قانون مفاد ہی کیونکر سیاست بن سکتا ہے

سیاست بجائے خود کوئی قانون نہیں البتہ سیاست کا قانون گر ہونا ممکن ہے۔

شعر:۔ اک دور وہ تھا روح فزا کیفیت اندوز کعبہ میں تھی اک عید تو بتخانے میں نوروز

حقیقت تو یہ ہے کہ اعتراض بالکل درست ہے اور اصلاح نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا ہے۔ مجیب نے حقیقی عید اور مجازی عید کی لفظی بحثوں میں پڑکر مفہوم اعتراض کو الجھا دینے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اعتراض شکست کا یہ پہلو نہایت شاندار رہے۔

شعر:۔ ایک آزردہ سی چتون میں بھی تھا حُسن کشاد ایک دزدیدہ نظر بھی گرمی افسانہ تھی

جس طرح اور مقامات پر جناب اثر نے "سوال از آسمان وجواب از ریسمان" پر اپنی تنقیدی بنیادیں قائم کی ہیں، اسی طرح یہاں بھی انھوں نے اعتراض نہ سمجھتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ایک واقعی زاید ہے سیماب صاحب کے "سی" اور جوش صاحب کے "سی" میں محل استعمال جداگانہ ہیں اس لئے ایک دوسرے کی سند نہیں بن سکتا۔ موضوع نظم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر عہد ماضی کے روادارانہ سلوک اور پرخلوص زندگی کے کامیاب منظر پیش کرنا چاہتا ہے مگر رعایات لفظی اور اظہار قابلیت واجتہاد نے شعر مبہم کردیا۔ حقیقت پسند احباب یہی فیصلہ دیں گے کہ سیماب صاحب کے مفہوم کو نیاز صاحب کے اصلاحی شعر نے پوری وضاحت کے ساتھ ادا کردیا۔

جناب اثر نے یہ فرما کر کہ نیاز صاحب کے اکثر افسانہائے حیات کی تخلیق کا باعث محض "دزدیدہ نگاہی" ہے اپنے دعوے کو اور کمزور کردیا۔ وجہ تخلیق افسانہ گرمی افسانہ نہیں بن سکتی کیونکہ گرمی کا لفظ کسی بات کی ارتقائی منزل کو ظاہر کرتا ہے چاہے اُس کی بنیادیں کمزور ہی کیوں نہ ہوں۔

سیماب۔ چاند کی نظروں میں ہے ابتک وہی عالم کشی سینۂ خورشید میں سوزِ حقیقت بھی وہی
گرمی تخلیق میں ابتک وہی ہے سوز وساز خوئے ضبط اُسکی وہی اور اسکی نخوت بھی وہی

اصلاح نیاز:۔ سینۂ خورشید میں ابتک وہی ہے التہاب چاند کی نظروں میں پرواز لطافت بھی وہی
عشق میں اور حُسن میں ابتک وہی ہے سوز وساز خوئے ضبط اُسکی وہی اور اسکی نخوت بھی وہی

عالم کشی پر اعتراض تو کچھ اتنا قوی نہیں البتہ چاند کی عالم کشی اور سینۂ خورشید کے سوز حقیقت کو گرمی تخلیق سے کوئی علاقہ نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اشعار دو متضاد معانی کے حامل ہیں درانحالیکہ شاعر کا یہ مقصود نہیں۔

ہاں معترض نے چاند کی پرواز لطافت اور سینۂ خورشید کے التہاب کو حسن وعشق سے استعارہ کرکے ایک بامعنی اصلاح دی ہے جس سے معترض کی اُستادانہ ذہنیت اور پختہ کلامی کا پتہ چلتا ہے۔

شعر:۔ بیکسی کے زرد چہرہ پر خوشی کا نور تھا افسر شاہی بساطِ محفل مزدور تھا

معترض کی درست مقالی کے اعتراف کے بعد یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ پیروں سے کچل کر افسر تو کیا سر بھی بساط بنایا جا سکتا ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ کسی شے کی (بالخصوص افسر و سر) پامالی سے اس کے بساط بن جانیکا کہاں تک امکان ہے ؟ ممکن ہے چودھویں صدی کے اس ایجاد و اختراع کے دور میں جناب اثر صاحب ایسا وسیع سر لیکر آئے ہوں جو کچل جانے کے بعد ایسی بساط بن سکے جس پر محفل مزدور کا انعقاد ہو۔

شعر:- تغیرات اور علی التواتر تصرفات اور بے محابا — کمال حسن و جمال کیا ہے زوال شیب و شباب کیا ہے

تحولات غریب اور غیر شاعرانہ لفظ ہی سہی لیکن معنی کے اعتبار سے ضروری ہے۔ اگر شیب کے زوال کو موت تسلیم کر لیا جائے تو جوانی کی موت کو کیا کہیں گے۔ موت زوال شیب نہیں بلکہ زوال زندگی کا نام ہے۔

شعر:- دورِ صبا میں اسد رچہ ہوا غم مجھ کو — اب مسرت کبھی ہوتی ہے مگر کم مجھکو۔

اصلاح نیاز:- دورِ صبا میں اسد رچہ ہوا غم مجھ کو — کہ مسرت کبھی ہوتی ہے تو کم کم مجھکو

معمولی عقل والے تو ضرور نیاز صاحب کے مصرعہ کو پھسپھسا کہیں گے۔ البتہ ارباب دانش اور ماہرین فن کی جوہر شناس نگاہیں ایسے گہر پاروں کی قدر کر سکتی ہیں۔

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

رہا شرم کا سوال تو اثر صاحب اپنے گریبان میں منہ ڈالکر دیکھیں "تو" اور "کم" بھرتی سمجھنے پر مدتوں گردن نہ اُٹھا سکیں گے۔

شعر:- مجسم ہو کے ملتی باریابی تیری محفل میں — ہم اک لمحہ میں مثل روح تیرے پاس آ جاتے

حقیقت یہ ہے کہ لفظی کشمکش نے نیاز صاحب کو معنویت سے بہت دور کر دیا ہے۔

شعر:- نعمتِ مقسوم کا ممنون ہونا چاہیئے — صاحب دولت کو ہے تحدیث دولت لازمی

سمجھ میں نہیں آتا کہ نیاز صاحب نے تحدیث کے معنی بیان کرنے اور گفتگو کرنے کے لینے کے بعد بھی تجدید وفا کے معنی کیونکر پیدا کر لئے۔ درانحالیکہ شعر کا مفہوم بھی یہ نہیں ہے۔

شعر:- شروع ہوتے ہیں کچھ واقعاتِ نو ساماں — مغنیہ سے کہو ختم کر فسانۂ دوش

مانا کہ ختم کر صحیح ہے لیکن اعتبار فصاحت سے گرا ہوا ہے۔ کم از کم ایک اُستاد کے لئے ایسی کمزوری شایان شان نہیں۔ ثانیاً مغنیہ واقعی افسانہ گو نہیں ہے۔ اکثر افسانے منظوم ہوتے ہیں مگر قیود غنا سے آزاد — مقاصد نظم و غنا میں جو فرق ہے اُس پر اثر صاحب دوبارہ غور فرمائیں۔

رنگین تیتری یا عورت

اس نظم کے متعلق شاعر اور معترض دونوں اپنی جگہ ایک درجہ رکھتے ہیں جس کا امتیاز ارباب نقد و نظر خود کر سکتے ہیں۔

اختتام پر مولانا نے جن اعتراضات کے اقتباس پیش کئے ہیں وہ بجائے خود ایک حقیقت کے حامل ہیں البتہ سیماب صاحب کے "بھی" اور غالب صاحب کے "بھی" میں جو امتیاز ہے اُس پر مولانا غور فرمائیں۔

رہا یہ کہ اس تنقید سے معترض کے علمی وقار کو جو صدمہ (بقول اثر صاحب) پہونچا وہ بھی دلیل طلب ہے۔ محض اپنے احباب اور بالخصوص تلامذہ کی تعریفوں سے خوش ہونا اپنے منھ میاں مٹھو بننے کے مصداق ہے۔ جناب عبدالحفیظ صاحب اثر صاحب کے خاص دوستوں میں سے ہیں اس لئے تنقید نیاز سے اثر صاحب کے ساتھ ہی ساتھ اُن کا برہم ہونا حیرت کی بات نہیں۔

رسالۂ ہندستانی کے اعتراضات کے جواب میں اثر صاحب نے سمن اور سما کے مسئلہ پر روشنی ڈالکر کافی دلچسپی کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سمن صرف اس لئے زمین کے معنی میں مستعمل ہے کہ وہ زمین کی پیداوار ہے تو جناب موصوف سے یہ پوچھنا غیر ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ آفتاب جو فضائے سماوی پر طلوع ہوتا ہے کیا آسمان کے معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے؟۔

ایک بات اور قابل غور ہے کہ اصلاح شعر و سخن کے لئے آگرہ اسکول کا اتباع ضروری ہے کیا یہ نظریہ تمام دنیا کے لئے قابل تسلیم ہے؟ اگر نہیں تو پھر اس کی وسعتیں اسکول تک ہی محدود رہنا چاہئیں — کار امروز محض آگرہ اسکول کا رسالہ نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے پیغام ہے اور دنیائے شعر و شاعری نے ابتک اساتذۂ سلف کے اتباع کو ضروری مانا ہے۔ اس لئے تنقید و تبصرہ میں جدید قوانین یا (بدعات) بغیر دنیا کے تسلیم کئے ہوئے اساسی اُصول نہیں بن سکتے۔ اگر اساتذۂ سلف کی عائد کردہ قیود بیکار ہیں تو ظاہر ہے کہ اُن کا کلام بھی اس دور کے لئے سند کا کام نہیں دے سکتا، پھر غالب و ذوق سے استنادسے کیا معنی؟ رہا یہ کہ قید و بند یا اغلاط شعری محض مبتدی کے لئے ہیں اُستاد کے لئے نہیں تو شاید یہ تسلیم کرنا پڑے کہ اُستاد کے معنی ہیں "مرتکب اغلاط کثیرہ" مگر شاید دنیا اسے بھی نہ مانے — مضمون کا اختصار کرتے ہوئے صرف ایک بات کا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ نگار کے مسلسل مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اعتراضات مولانا نیاز نے درست کئے تھے اور غالباً اثر صاحب نے اُن کی درستگی کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔ اپنے مضمون کو اثر صاحب سے مخاطب کرتے ہوئے اس شعر پر ختم کرتا ہوں:-

مختصر ہست کہ گفتم دبدل ترسیدم ۔۔۔ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار ست

اگر ضرورت ہوئی تو انشاء اللہ آئندہ اس موضوع پر بعنوان انکشاف راز ایک مبسوط و مکمل تبصرہ ہدیۂ ناظرین کرونگا۔

ریاضت انصاری

باب المراسلۃ والمناظرہ

تحسین سخن شناس یا اعترافِ دلدادگی ؟

(جناب ناطق مالوی)

قبلۂ اشرف !

لفافہ میں جو کچھ ملفوف ہے۔ وہ آپ دیکھ ہی لیں گے۔ مجھے صرف اتنا اور عرض کرنا ہے۔ کہ جس غور وفکر سے آپ نے "تصویر" کی غزل کا معائنہ فرمایا تھا اُس سے کہیں زیادہ میرے معروضات قابل توجہ ہیں۔ تاکہ میری غلطی آپ کی ذمہ داری کی شکل میں تبدیل ہو جائے۔ والسلام

"مت پوچھ"

گزشتہ مہینہ کے نگار میں۔ "خاتون بدایونی" کی ایک غزل شایع ہوئی ہے۔ پیر طریقت "حضرت نیاز" نے جس انداز میں داد کلام فرمائی ہے وہ بجائے خود ایک مستقل شعر ہے۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ایک شوریدہ سر اپنی رندانہ جرأتوں کو سینہ میں خاکستر ہوتے ہوئے دیکھے اور زبان پر "اُف" بھی نہ لائے۔

ہفوات سطورہ میں کوشش تو اس بات کی کی گئی ہے کہ جنس لطیف سے ادب و احترام کا کوئی معمولی پہلو بھی مجروح نہونے پائے۔ تاہم "وسعت" جس شے کا نام ہے۔ اُسے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ گفتگو کی ادنےٰ لغزش بھی (اگر پائی جائے تو) بجائے تعریض کے خلوص تصور کئے جانے کے قابل ہے۔

خاتون موصوف معاف فرمائیں کہ آخری اشعار میں "اُن" سے جو خطاب کیا گیا ہے۔ وہ ایک والہانہ کمزوری ہے۔ اپنے ہی جذبات نیاز و نیائش کی۔

محترمہ تصویر سے:- نہ پوچھ اپنے بیاں کی لطافتیں مت پوچھ ہیں شعر شعر میں پنہاں نزاکتیں مت پوچھ

ہر ایک "بول" سے پیدا ہے شوخی گفتار
کلام سادہ کی رنگیں حلاوتیں مت پوچھ

دلوں میں ہوتی ہے بیدار جس سے روح طرب
حقیقتاً ہیں یہی۔ وہ عبارتیں مت پوچھ

زباں کی شستگی و دلفریبیاں تو بہ!
بیان و نطق کی موزوں اضافتیں مت پوچھ

کھلا ہوا ہے گلستان حسن و رعنائی
بہار باغ معانی کی نزہتیں مت پوچھ

ادب نواز تخیل کی دلربا شکلیں
لطیف ذوق وفا کی نزاکتیں مت پوچھ

حدیث "بزم عدو" پر سنا کہ سنکے اسے
گزر گئی ہیں۔ جو دل پر قیامتیں مت پوچھ

"ان" سے:- ستم کے لطف جفاؤں کی لذتیں مت پوچھ
نیاز مند وفا کی مسرتیں مت پوچھ

وہ بار بار سر بزم پرسش خاموش
تری نگاہ کی کافر شرارتیں مت پوچھ

تجھے قسم ہے۔ ترے ذوق بے نیازی کی
نہ پوچھ مجھ سے مرے دل کی حسرتیں مت پوچھ

ہم اک جہان تمنا ہیں۔ دیکھ ہم کو نہ چھیڑ
ہمارے رنج۔ ہماری مصیبتیں مت پوچھ

مجھی سے پوچھ ارے میرے پوچھنے والے
رقیب سے مری مایوس حسرتیں مت پوچھ

وہ میری عرض تمنا پہ تیرا ہنس دینا
وہ تیرے ہنسنے پہ میری ندامتیں مت پوچھ

غضب کا مصرعۂ "تصویر" ہے مگر ناطق
گزر گئی ہیں۔ جو دل پر قیامتیں مت پوچھ

(نگار) انگریزی کا مشہور مقولہ ہے:-

Imitation is the Sincerest form of flattery

یعنی کسی شخص کی نقل و تقلید، تحسین و اعتراف کی نہایت پُرخلوص صورت ہے۔ اس لئے اصولاً محترمہ تصویر (بدایونی) کو آپ کے ان جذبات کی قدر کرنا چاہئے، رہ گیا میں سو ظاہر ہے کہ مجھے اس میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں، ایک ہدیہ پیش کرتا ہے، دوسرا قبول کرتا ہے یا رد، مجھے اس سے کیا واسطہ کہ ہدیہ کی نوعیت کیا ہے اور رد و قبول کی کیا؟ لیکن اگر دونوں فریق میں بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں جناب ناطق سے ضرور دریافت کرتا کہ ایک غزل میں آپ نے محترمہ تصویر سے خطاب کیا ہے اور دوسری میں "اُن" سے تو کیا یہ "اُن" کا اشارہ کسی اور مشکدۂ مقصود کی طرف ہے ــــ اگر نہیں، تو میری رائے میں اس کا عنوان "پھر انھیں سے" زیادہ موزوں ہوتا۔ علاوہ اس کے ایک فنی استفادہ بھی جناب ناطق سے کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ پہلی غزل کے چوتھے شعر میں جو

شستگی کا عطف حرف (واو) سے "دلفریبیاں" پر کیا گیا ہے کیا وہ درست ہے؟ - دلفریبی فارسی لفظ ہے لیکن اس کی جمع "دلفریبیاں" فارسی نہیں، اس لئے شستگی کے ساتھ اس کا عطف بجائے (واو) کے (اور) سے ہونا چاہئے تھا۔ اگر یہ مصرعہ یوں ہوتا تو کوئی حرج تھا

زباں کی شستگی و دلکشی، معاذ اللہ!

اسی غزل کے آخری شعر میں "سنا کر سُنکے اسے" بھی نظر ثانی کا محتاج تھا۔

دوسری غزل کے دوسرے شعر میں بجائے "اپنی نگاہ" کے "تیری نگاہ" اور تیسرے شعر میں بجائے "اپنے ذوق" کے "تیرے ذوق" لکھنا بھی غالباً محل نظر ہے۔

مقطع میں لفظ (مگر) کا صرف بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا:۔

غضب کا معرکۂ تصویر ہے یہ اسے ناطق

یوں بہ حیثیت مجموعی آپ کی دونوں غزلیں خوب ہیں اور خصوصیت کے ساتھ دوسری غزل کا دوسرا اور چھٹا شعر تو قیامت ہے۔ مگر میں کیا اور میری پسند کیا۔ "اُن" سے پوچھئے دیکھئے وہ کیا کہتی ہیں؟

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

(اڈیٹر نگار کے قلم سے)

اُردو زبان میں بالکل پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے، اگر آپ گناہ کی دنیا کی سیر کرنا چاہتے ہیں تو اس تصنیف کو ملاحظہ فرمائیے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا چیز ہے۔ فحاشی کی تمام صورتیں اور انکی مفصل تاریخ عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک ان سیکڑوں عجیب و غریب واقعات کے جنکی طرف یوں کبھی آپ کا ذہن بھی نہ منتقل ہوا ہوگا اس کتاب میں موجود ہیں۔ الغرض یہ کتاب "جنسیات" کے موضوع پر ایک سائکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے اور ممکن نہیں کہ آپ ایکبار اسکو شروع کرنے کے بعد آخر تک دیکھنے پر مجبور نہ ہوں۔

قیمت غیر مجلد تین روپیہ، مجلد ۳ علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کی رعایت۔ منیجر نگار لکھنؤ

مجموعۂ استفسار و جواب

جلد دوم

چھپ کر طیار نہیں ہوا ہے، اس لئے دوسری طیار شدہ کتابوں کے ساتھ اس کا آرڈر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جس وقت یہ مجموعہ شایع ہوگا، اس کی اطلاع ذریعہ نگار سب کو ہو جائے گی اور اسی وقت قیمت بھی اس کی ظاہر کر دی جائے گی، فی الحال نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ضخامت و قیمت کیا ہو گی۔

منیجر نگار لکھنؤ

ملاحظات

(بہ سلسلۂ صفحہ ۸)

ایران کی ادائے آزادانہ

اس وقت عالم اسلامی اور خصوصیت کے ساتھ اثنا عشری دُنیا میں حکومت ایران خاص توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے اور عراق و ہندوستان اور شاید خود ایران میں بھی بعض جگہ شیعہ حضرات ان جدید احکام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں جو رضا شاہ پہلوی کی طرف سے حال ہی میں شایع ہوئے ہیں۔

وہ احکام جن کے خلاف خصوصیت کے ساتھ اظہار برہمی کیا جا رہا ہے، چار ہیں، ایک یہ کہ عورتوں کے لئے پردہ و نقاب کی ضرورت نہیں ہے اور انھیں بے حجابانہ سامنے آجانا چاہئے، دوسرا یہ کہ متعہ اور تعدد ازواج دونوں قابل ترک ہیں، تیسرا یہ کہ ٹوپی اور ملبوس مغربی وضع کا استعمال کیا جائے۔ چوتھا یہ کہ کسی شہر میں تین مسجدوں سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں بحث کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ حکومت ایران نے ایسے احکام کیوں نافذ کئے اور دوسرا یہ کہ ان احکام کو شیعہ جماعت کیوں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔

وہ حضرات جنھوں نے رضا شاہ پہلوی کے دورِ حکومت کا ابتدا سے مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ سرزمین ایران میں قاچاری حکومت کا ختم ہونا اور اس کی جگہ ایک ایسے شخص کی حکمبرداری کو قبول کر لیا جانا جو طبقۂ عوام سے متعلق تھا، صرف یہی معنی رکھتا تھا کہ وہاں دور استقراطی ختم ہو کر اس کی جگہ ڈماکریسی لے رہی ہے جو اس عہد کی سیاسیات کا اُصول اساسی ہے۔

پھر چونکہ ڈماکریسی بنیاد ہے اشتراکیت کی اس لئے اگر ایران اپنے احکام میں مذہبی تقشف کی رعایت کرنے پر آمادہ نہیں تو حیرت نہ کرنا چاہئے کیونکہ دورِ اشتراکیت میں سب سے پہلے جس گرفت کو ڈھیلا کیا جاتا ہے وہ مذہب کی گرفت ہے۔ وہ زمانہ، جب بادشاہ مذہب کے باب میں بھی اتنا ہی سخت ہوتا تھا جتنا سیاست دنیادی میں ختم ہو چکا ہے اور نہ اب وہ دور باقی ہے جب حکومت کا نصب العین، سلطنت کا مقصود اور سیاست کا مدعا صرف مذہب کی اشاعت ہوا کرتا تھا۔ یہ زمانہ ہے علوم صناعی کی ترقی کا، تجارتی مقادمت کا، اقتصادی تفوق و برتری کے حصول کا اور مرکزیت پیدا کرنے کے لئے مذہب کے بجائے قومیت کا جھنڈا بلند کرنے کا، اس لئے مذہب کو

کسی حکومت کے نظام میں زیادہ سے زیادہ تنی ہی جگہ مل سکتی ہے، جتنی قومی رسم و رواج کو اور چونکہ تنظیم جدید میں اجتماعیت قائم کرنے کے لئے حد درجہ ہم آہنگی و یکسانیت پیدا کرنے کا خیال سامنے ہوتا ہے اس لئے سب سے پہلے روایتی زندگی کو محو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جس کی بنیاد وہی اختلاف آراء پر قائم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ روایتی زندگی کا غلاق صرف مذہب ہے اور صرف قیام مذہب پر اس کی زندگی کا انحصار ہے۔

نفسیات کا یہ بالکل کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ جس طرح انسان کا بطون اس کی وضع وصورت سے ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا، بالکل اسی طرح وضع وصورت کا اثر بھی انسانی احساس پر بہت پڑتا ہے۔ ہم ایک شخص کو دیکھ کر جسکی داڑھی لمبی ہے، عبا طویل ہے، سر پر عمامہ اور ہاتھ میں تسبیح ہے یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ سخت مذہبی انسان ہے۔ اسی طرح جب ہم ایک بے ریش و بروت انسان کو، انگریزی وضع و ملبوس میں دیکھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اس کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں یا بہت کم ہے۔ لیکن اگر ہم اُس مذہبی انسان کو غیر مذہبی اور اس غیر مذہبی انسان کو مذہبی بنانا چاہیں تو منجملہ دیگر تدابیر کے ایک نفسیاتی تدبیر یہ بھی ہوگی کہ مولانا کی داڑھی مونڈ کر اس رند کے چہرہ پر لگا دیجائے اور اس کا کوٹ پتلون اُتار کر اُن کے قامت مبارک کو آراستہ کر دیا جائے۔ ممکن ہے کہ اول اول ان دونوں کو یہ تغیر پسند نہ آئے، لیکن رفتہ رفتہ اُس کے لئے داڑھی کا بوجھ گوارا ہو جائیگا اور یہ صاف چہرہ کی نغومت و تازگی کو محسوس کرنے لگیں گے۔

یہی وہ نفسیاتی نکتہ ہے جس پر ترکی میں مصطفےٰ کمال نے عمل کیا اور اب اس کی تقلید رضا شاہ پہلوی نے کی ہے۔ دنیا میں جب کوئی قوم انتہائی انحطاط کو پہونچ جاتی ہے اور اس کا احساس بالکل جامد و معطل ہو جاتا ہے تو پھر صرف وہی تدبیر اُس میں حرکت پیدا کر سکتی ہے جو بیک وقت دفعۃً ذہنوں میں انقلاب پیدا کر دے اور اس قسم کے احکام جو ترکی و ایران میں نافذ کئے گئے ہیں بدرجۂ اتم اس مقصود کو پورا کرنے والے ہیں۔

پھر ایران و ترکی میں اسوقت جو کچھ ہو رہا ہے ممکن ہے وہ اب سے سیکڑوں سال قبل کے بنائے ہوئے قانون کے منافی قرار دیا جائے، لیکن ضروریات زمانہ اور تمدن عالم کے موجودہ بین الاقوامی نظام کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے اجتماعی و ملی مفاد کے لئے بہر نوع اس کو مفید تسلیم کرنا پڑے گا۔ علاوہ اس کے اگر خالص مذہبی نقطۂ نظر سے ان مسائل پر غور کیا جائے تو بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان احکام میں کیا کفر و الحاد ملا ہوا ہے عورتوں کا پردہ، اسلام کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی مخالفت مذہب کی مخالفت قرار دیجائے، نہ ملبوس و وضع کا تغیر اعتقادات کے تغیر کو مستلزم ہے، اسی طرح اگر تعدد ازواج اور متعہ کو ناجائز قرار دیا گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ خدا کی مرضی کے خلاف حلال کو حرام قرار دیا گیا ہے درست نہیں، کیونکہ نکاح وغیرہ کے مسایل قوم کی معاشرت سے متعلق ہیں اور وقت و زمانہ کی مصلحت کے لحاظ سے ان میں ہمیشہ تغیر ہو سکتا ہے

یعنی اگر آج تعددِ ازواج یا متعہ بربنائے مصالحِ ملکی مناسب نہیں تو کل پھر ان کے جواز کا حکم صادر ہو سکتا ہے اگر ضرورت اس کی مقتضی ہو، رہا یہ امر کہ ایران کے حالات کا اقتضا، یہ تھا یا نہیں، سو غالباً ہندوستان و عراق کے مسلمانوں سے زیادہ وہیں کے اربابِ فکر و سیاست کو اس کے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ رہا یہ امر کہ کسی شہر میں تین مسجدوں سے زیادہ قائم نہ رکھی جائیں، سو میرے نزدیک اس سے زیادہ مفید کوئی بات اور ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ مسلمانوں کی اجتماعیت میں انتشار پیدا کرنے کا ایک سبب مساجد کی کثرت بھی ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ہر محلہ میں متعدد مسجدیں موجود ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ ایک ہی محلہ کے مسلمانوں کو بھی کبھی ایک جگہ جمع ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر مسجدیں کم ہوں گی تو ظاہر ہے کہ ان کا اجتماع بھی زیادہ ہوگا اور رشتہ اخوت و ہمدردی بھی زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ علاوہ اس کے یوں بھی دیکھئے کہ شہروں میں کتنی مسجدیں غیر آباد و ویران رہتی ہیں اور ان کی ویرانیوں کو دیکھ کر غیر مذاہب والے کیا سمجھتے ہوں گے۔ اس لئے اگر سجدہ گاہوں کی کثرت کی بجائے سجدہ کرنے والوں کی تعداد بڑھائی جائے تو زیادہ موزوں ہے اور اس کی تدبیر صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مسجدوں کی تعداد کو کم کیا جائے۔

الغرض رضا شاہ پہلوی کا کوئی حکم میرے نزدیک ایسا نہیں ہے جس پر ہنگامہ بپا کیا جاتا، لیکن افسوس ہے کہ مشہد مقدس میں شیخ بہلول نے یہ ہنگامہ بپا کیا اور حکومت کو تیغ و تفنگ سے کام لینا پڑا جس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی کچھ مارے گئے، کچھ زخمی ہوئے اور کچھ بھاگ گئے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی اصلاحیں جبر و اکراہ کے ساتھ مناسب نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اسوقت ایران میں کتنے نفوس ایسے ہیں جو خوشی سے ان احکام کی پابندی پر مائل نہیں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ سوائے مولویوں یا اس جماعت کے جو قدیم مذہبی خیال کی پابند ہے، نئی نسل کے تمام افراد رضا شاہ پہلوی کے ہم آہنگ ہیں اور اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ جس وقت یہ احکام نافذ ہوئے تو دفعتہً ملک کی تمام نوجوان لڑکیاں بے نقاب باہر نکل آئیں اور مغربی ٹوپی کی قیمت تیس تو مان تک پہونچ گئی۔

اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہندوستان کے شیعہ حضرات کا جلسے کر کر کے مخالفت کی آواز بلند کرنا، جن لوگوں نے مشہد میں حکومت کے خلاف آواز بلند کر کے اپنی جانیں دی ہیں انھیں شہداء کا لقب دیکر فاتحہ خوانی کے مراسم ادا کرنا کیا مفید ہو سکتا ہے۔ مسلمانانِ ہند کی یہ ادا کہ وہ اپنے حال پر ماتم کرنے کے بجائے ایران و حجاز کے معاملات پر سر دھننا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

حبش اور اطالیہ کی آویزش اس وقت ساری دنیا کی نگاہیں افریقہ کی اس سیاہ فام زمین پر لگی ہوئی ہیں جس کو سفید تہذیب سے آراستہ کرنے کے لئے میسولینی نے اپنی تمام محاربانہ

قوتوں کو بروئے کار لانے کا عزم کرلیا ہے۔ اس لئے غالباً بے محل نہ ہوگا اگر ان مدعیان شائستگی کی تہذیب پرستی کی حقیقت پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجائے۔

۵ دسمبر ۱۹۳۴ء کو حبش اور برطانیہ کے نمایندوں کا ایک کمیشن جس کے ساتھ کچھ حبشی فوج بھی ہے ولوال کے قریب حدبندی کے مسئلہ پر غور کررہا ہے کہ اطالوی فوج کا کپتان دفعۃً بغیر کسی اطلاع کے حملہ کردیتا ہے اور حبشی سپاہ کے ایک بڑے حصہ کو تہ تیغ کردیتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ خون کا گھونٹ شاہ حبش کے حلق سے نیچے اترتا، خود اٹلی کا سفیر اُٹھا، یہ احتجاج کرتا ہے کہ "مسلح حبشیوں نے بغیر کسی اطلاع کے ہم پر حملہ کیا" اور اس کا نتیجہ اٹلی کی طرف سے اس مطالبہ کی صورت میں نکلتا ہے کہ "حبشی گورنر، ولوال آکر معافی چاہے، اطالوی جھنڈے کے سامنے سرنگوں ہو، اور حبش کی حکومت دو لاکھ پونڈ بطور تاوان ادا کرے"

غریب حبش نے اس مسئلہ کو جمعیۃ اقوام کے سامنے پیش کردیا، لیکن بدقسمتی کہئے یا ملی بھگت کہ آج تک کوئی فیصلہ اس کا وہاں سے بھی صادر نہیں ہوا۔

جن لوگوں نے حبش کے نقشہ کو دیکھا ہے انھیں معلوم ہے کہ وہ چاروں طرف اطالوی، برطانوی اور فرانسیسی مقبوضات سے محصور ہے۔ شمال میں اریٹریا اور مشرق وجنوب کے گوشہ میں ایک وسیع رقبہ اٹلی کے قبضہ میں ہے جسے اطالوی سومالی لینڈ کہتے ہیں، مشرق میں برطانوی اور فرانسیسی سومالی لینڈ کا حصہ ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ اسوقت حبش کے مسئلہ سے گہرا تعلق رکھنے والی یوروپ کی تین حکومتیں، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی باہمی رقابت نے اسوقت تک حبش کی خودمختاری قائم رہنے دی، ورنہ ان میں سے کوئی ایک کب کا اس کو ہضم کرچکا ہوتا۔

اس وقت تک حبش اور ان سلطنتوں کے درمیان، یا حبش کے متعلق خود ان تینوں کے مابین جو جو معاہدے ہوچکے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک آہستہ آہستہ اپنے قدم وہاں جمانا چاہتی ہے، چنانچہ اپنی سرحد سے بڑھ کر ولوال کے کنووں پر اٹلی کا قابض ہوجانا، فرانس کا اپنے علاقہ سے ادیس ابابا تک ریل جاری کردینا اور انگلستان کا نیل ارزق کے لئے اٹلی سے خفیہ سازباز کرنا، سب اس امر کا ثبوت ہیں کہ آج نہیں تو کل حبش کو ختم ہونا ہے خواہ وہ ان سلطنتوں کے باہمی مفاہمت سے ہو یا جنگ وجدال سے۔

بحالت موجودہ یہ مسئلہ جمعیۃ اقوام کے سامنے پیش ہے اور مہینوں گزرجانے کے بعد بھی اس وقت تک کوئی بات طے نہیں ہوئی۔ اٹلی کہتا ہے کہ حبش ایسے وحشی ملک کو جمعیۃ اقوام میں شامل ہی کیوں کیا گیا اور اگر وہ اس کا ممبر رہتا ہے تو میں رخصت ہوتا ہوں۔ برطانیہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جاپان اور جرمنی پہلے ہی علحدہ ہوچکے ہیں اگر اٹلی بھی علحدہ ہوگیا تو جمعیۃ کا وجود ہی ختم ہوجائے گا، اس لئے وہ ایک طرف یہ بھی ظاہر کرتا جاتا ہے کہ حبش کی خودمختاری قائم رہنا ضروری ہے اور دوسری طرف اٹلی کو بھی سمجھا رہا ہے کہ گھبرانے کی کونسی بات ہے، تمھارے مطالبات پر غور نہ ہو جبھی

شکایت کرنا۔ الغرض سیاسیات مغرب کی وہ مشہور چال جس میں برطانیہ کو کمال حاصل ہے چلی جارہی ہے اور اگر باہمہ گر کوئی مفاہمت فرانس، برطانیہ اور اٹلی کے درمیان اندرونی طور پر ہو چکی ہے تو اس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ اٹلی جمعیۃ الاقوام کی تمام سفارشوں کو رد کر دیگا اور پوری قوت کے ساتھ میدان جنگ میں اُتر آئے گا۔ پھر اگر جبش کو شکست ہوئی تو شرائط صلح میں فرانس اور برطانیہ کا حصہ بھی (اُسی خفیہ معاہدہ کی رُو سے) تقریباً برابر ہی رہے گا اور اگر اٹلی تھک گیا تو پھر جبش کے ساتھ برطانیہ اور فرانس کی یہ نمائشانہ ہمدردی، دوستانہ طور پر جبش سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے گی۔ اس میں شک نہیں کہ یوں اٹلی و جبش کا مقابلہ ہی کیا، لیکن وہاں کے جغرافی حالات ایسے نہیں ہیں کہ اٹلی آسانی سے کامیاب ہو سکے۔ ملک جبش کا مسخر ہو جانا ممکن ہے لیکن جبشی قوم کا مغلوب ہونا بہت دشوار ہے، اس لئے اٹلی کی کامیابی بھی ایک لحاظ سے ناکامی ہی متصور ہوگی اور اس کا اپنی اقتصادی دشواریوں سے بہ آسانی گزر جانا تقریباً ناممکن ہوگا۔ الغرض اسوقت نہ صرف یوروپ بلکہ ساری دنیا سخت خطرہ میں مبتلا ہے اور اگر جنگ چھڑ گئی تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے شعلے کہاں کہاں بھڑک اُٹھیں گے۔

لکھنؤ اُردو اکاڈمی

اس سے قبل ناظرین نگار کو اس تجویز کی خبر دی گئی تھی جو اُردو اکاڈمی کے قیام کے لئے اہل لکھنؤ کے زیر غور تھی اور یہ امر حد درجہ باعث مسرت ہے کہ آخرکار وہ تجویز بروئے کار آ کر رہی اور ایک ادارہ "لکھنؤ اُردو اکاڈمی" کے نام سے قایم ہو چکا ہے، جو یقیناً اپنے مقاصد و آمال کے لحاظ سے نہایت برمحل و اہم ہے۔ اس ادارہ کا مقصد بالکل علمی ذرایع سے متعلق ہے اور صرف کہکر خاموش ہو جانے کی کوئی گنجایش اس کے پروگرام میں نہیں ہے۔ ارادے بلند ہیں اور تدبیریں مستحکم اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ اگر اہلِ ذوق و ارباب وطن نے ہمدردی کی تو یہ انجمن صحیح معنی میں خدمت زبان کے فرایض انجام دے سکیگی۔ تعیین مقاصد کے بعد اس کا دستور العمل بھی جلسۂ عام میں کافی بحث و گفتگو کے بعد طے ہو چکا ہے اور اجراء کار کے لئے دفتر بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ اکتوبر میں دوسرا جلسۂ عام طلب کر کے انتخاب عہدہ داران کی کارروائی عمل میں لائی جاویگی اور اس کے بعد وفود مختلف مقامات کا دورہ کرنے کے لئے روانہ کئے جائیں گے۔

جو صاحب اس کے مقاصد اور دستور العمل ملاحظہ فرمانا چاہیں وہ جنرل سکریٹری لکھنؤ اُردو اکاڈمی سے مطبوعہ کاپی طلب فرمالیں۔

ضرورت ہے

ایک سربرآوردہ شیعہ خاندان کی لڑکی کے لئے ایک بر کی جو شیعی مذہب کا ہو اور متوسط الحال زندگی بسر کرنے کے کافی ذرایع رکھتا ہو۔ لڑکی ہر لحاظ سے ایک شریف گھر کی رونق بننے کی اہلیت رکھتی ہے — ن - بذریعہ دفتر نگار۔ لکھنؤ

اُردو میں بالکل نئی اور پہلی کتاب

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیازؔ کے قلم سے

اسمیں تاریخی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے فحاشی و عصیانگاری پر عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک ایک بسیط تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کن کن قوموں میں کس وقت کیسی کیسی فحاشیاں رائج ہوئیں اور اخلاق انسانی پر اس کا کیا اثر پڑا۔ — یہ کتاب نہایت نادر معلومات اور عجیب و غریب واقعات تاریخی کا مجموعہ ہے۔ اور اس موضوع پر اس وقت تک کوئی کتاب اُردو میں پیش نہیں کی گئی۔

اس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور اُن کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالیگئی ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کے بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنیکے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز حالات و واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہونگے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف عہ میں۔ اور غیر مجلد عا ر میں ملے گی۔ اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ہیر میں اور غیر مجلد ہے ر میں علاوہ محصول ۸ر کے ملیگی۔ اگر ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی پی روانہ کی جائے

مینجر نگار لکھنؤ